معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

* سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں بینک ڈرافٹ درج ذیل نام [illegible]

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

* رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ [illegible]
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۴ ماہ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۰۰ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

داعی الی اللہ کی وفات

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ محفلِ دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو پچھلے برس ہی سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا یعنی اس دور کے بہت مقبول و مقدس بزرگ، دنیائے اسلام کے محبوب و محترم عالم، عرب و عجم کی سرمایۂ افتخار و نازش ذات، شرق و غرب کی موقر و مکرم ہستی، ہر فرقہ و مذہب کے معزز و معتمد شخص، انسانیت کے پیام رساں اور علمبردار، مسلمانوں کے راہبر و رہنما، دین و مذہب کے عاشق و شیدائی، اسلام کے داعی و نقیب، ایمان و یقین کے حامل و مبلغ، عزیمت و جہاد کے پیکر، خانۂ کعبہ کے کلید بردار، ہندوستان میں سرمایۂ ملت کے نگہبان، ندوۃ العلماء کے ناظم، دارالمصنفین کے روحِ رواں، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے صدر، رابطۂ عالمِ اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی کے تاسیسی رکن، رابطۂ ادب اسلامی کے بانی و صدر، اسلامک سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی کے چیرمین اور ہند و بیرونِ ہند کے مختلف اداروں اور انجمنوں کے سربراہ اور سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ / ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو اس سرائے فانی کو الوداع کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اور اپنے لاکھوں عقیدت مندوں، قدردانوں، رفیقوں اور عزیزوں کو غم زدہ اور سوگوار چھوڑ کر زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا   لیوم کریھۃ وسداد ثغر

بیسویں صدی کے اختتام سے ایک برس پہلے جب شمسی سال کے ختم ہونے میں ایک دن رہ گیا تھا تو یہ الم ناک اور دل دوز خبر بجلی بن کر گری:

نعی الرکب اوفی حین آبت رکابھم   لعمری لقد جاؤا بالشر فاوجعوا

نعوا باسق الافعال لا یخلفونہ   تکاد الجبال الصم منہ تصدع

عین نصف النہار کے وقت وہ آفتاب عالمتاب غروب ہو گیا جس سے ہندوستان اور پوری دنیائے اسلام منور تھی، اس وجودِ مقدس کا خاتمہ ہو گیا جس کے ذکرِ جمیل سے مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، جدید تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور سیاست و حکومت کے ایوان پُرشور رہتے تھے، وہ برگزیدہ ہستی معدوم ہو گئی جس کے ایک ہاتھ میں جامِ شریعت اور دوسرے میں سندانِ عشق تھا، وہ میرِ کارواں رخصت ہوا جس کا شغل ذکر کے ساتھ فکر اور جس کا معمول تسبیح و مناجات کی طرح وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل تھا۔ وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیر زمانہ تھا اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بیگانۂ ایام۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے علم و عرفان اور شریعت و طریقت کی بزم روشن تھی، اس کے فیض سے ایمان کی بادِ بہار چل رہی تھی، معرفت و یقین کی دوکان آراستہ تھی، دریائے علم رواں اور دوا دی ارزاں تھی، اس کی ذات لکھنؤ اور رائے بریلی میں فضل و کمال، محبت و معرفت، یقین و نگاہ اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں تھی، اس کی ہستی سیرت و خلق محمدی، شاہ علم اللہ کے زہد و ریاضت، سید احمد شہید کے جہد و جہاد اور مولانا عبدالحئی کے علم و دانش کا مجموعہ تھی اور اس کی ذات میں اسلاف اور اپنے بزرگ اجداد کی بہت سی روایات و خصوصیات اکٹھا ہو گئی تھیں، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تصنیف اور دین و ملت کی راہ میں جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص۔

ولیس علی اللہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

---

۲۲ رمضان المبارک کو جمعہ کی نماز پڑھ کر بعض اعیانِ شہر کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک صاحب کے فون سے اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی۔

تصدیق اور تدفین کا وقت معلوم کرنے کے لئے لکھنؤ اور رائے بریلی فون کرایا مگر پتہ نہیں چلا، خبر پھیلی تو دارالمصنفین کے احاطہ کے لوگ، شبلی کالج کے اساتذہ اور شہر کے بعض حضرات میری قیام گاہ پر جمع ہوگئے، ڈاکٹر مسیح الرحمن لکچرر شبلی کالج نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی مولانا سعید الرحمن اعظمی کے یہاں فون کرایا تو خبر کی تصدیق ہوگئی اور ۴ ½ بجے میں ان کے اور اپنے رفقا، عزیزوں اور ڈاکٹر سلطان سلطان رکن مجلس انتظامی دارالمصنفین کے ساتھ روانہ ہوا، مگر تکیہ سے ۳ کلو میٹر پہلے ہی گاڑی روک دی گئی، ہم لوگ پیدل چل پڑے، راستے میں آدمی ہی آدمی تھے، کچھ تو نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوکر واپس آرہے تھے اور کچھ بے تابانہ تدفین میں شریک ہونے جارہے تھے ہم لوگوں کو جنازے کی سعادت سے محروم رہ جانے پر بڑا قلق ہوا، دو تین گھنٹے گزار کر بہ مشکل مولانا کے خواہر زادگان مولانا سید محمد رابع اور مولانا سید محمد واضح سے ملاقات کرکے ۹ بجے صبح اعظم گڑھ واپس اس حال میں آئے۔

اذا ما دعوت الصبر بعدک والبکا   اجاب البکا طوعا ولم یجب الصبر

کئی روز تک گم صم رہا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا، قلم اٹھانے کا یارا نہ تھا، حیص بیص میں دن بیت گئے، ہفتے گزر گئے، جنوری کے آخری عشرے میں مولانا مستقیم احسن نے بمبئی سے فون کیا "ابھی تک معارف نہیں پہنچا، مولانا پر مضمون کا شدید انتظار ہے"۔ حکیم محمد مختار اصلاحی اور پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی اور دوسرے قدردانان معارف کی طرف سے بھی ماتمی تحریر کے لئے بے قراری ظاہر کی گئی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی   دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس پیہم تقاضے اور شدید اصرار نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا مگر اسی اثنا میں اعظم گڈھ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس کی زد سے دارالمصنفین بھی محفوظ نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا

ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا منظر تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات نہ تنہا ان کے عزیزوں اور نیازمندوں کا حادثہ ہے اور نہ دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی دنیا ویران ہوئی ہے، بے شمار ادارے، تنظیمیں اور انجمنیں بے رونق ہوگئی ہیں، امت مرحومہ کا سرمایۂ اعتماد جاتا رہا، عالم اسلام کا سہارا ختم ہوگیا، تباہ و خستہ حال ہندوستان کا غم خوار چلا گیا، آہ وہ پُر درد آواز خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر سانحہ پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی تھی، واحسرتا وہ بے قرار دل ساکت ہوگیا جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت پر تڑپتا اور تڑپاتا تھا، وا اسفا وہ اشک آلود آنکھیں بند ہوگئیں جو دین و ملت کے ہر غم میں خوں بار رہتی تھیں، ہائے اس پُرجوش سینہ کا تلاطم ختم ہوگیا جو آلام و مصائب کے پہاڑوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا تھا، ہم کس کس چیز کا ماتم کریں اور کس کس کے لئے روئیں، وہ ایک فرد نہیں ایک قوم، ایک شخص نہیں ایک ملت اور تنہا نہیں مجموعۂ صفات و کمالات تھا۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد   ولکنہ بنیان قوم تھدما

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پدری سلسلہ حضرت امام حسنؓ پر اور مادری سلسلہ حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت امام حسنؓ کے صاحب زادے حسن مثنیٰ سے امام حسینؓ کی چھوٹی دختر فاطمہ صغریٰ منسوب تھیں، اس لئے ان کے خاندان کو حسنی حسینی کہا جاتا ہے، اس خاندان کے پہلے بزرگ جو مدینہ منورہ سے ہندوستان تشریف لائے وہ امیر قطب الدین محمد المدنی تھے جو شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے اور جلیل القدر ولی تھے، انہوں نے کڑا مانک پور اور اس کے نواح کو نور اسلام سے منور کیا۔ کڑا میں ان کی اولاد تقریباً ایک صدی تک عزت اور نیک نامی کی زندگی بسر کرتی رہی، جب اس خانوادے کے ایک بزرگ میر سید قطب الدین محمد ثانی کو جائس کا قاضی مقرر کیا گیا تو وہ وہاں منتقل ہوگئے، ان کے بیٹے سید علاء الدین نصیر آباد کے قاضی ہوکر وہاں جا بسے۔

ان کے ایک پوتے قاضی سید احمد تھے جن کے فرزند سید محمد معظم کے دو نامور فرزند تھے، سید محمد فضیل اور سید محمد اسحق۔ اول الذکر حضرت سید آدم بنوریؒ کے جلیل القدر خلیفہ اور ممتاز عارف باللہ حضرت شاہ علم اللہؒ کے والد بزرگوار تھے جن کی پانچویں پشت میں مرد حق آگاہ اور مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مؤخر الذکر کی نسل سے تھے جن کی نوائے حق اور نالۂ درد سے عرب و عجم گونج رہا ہے ؎

زیں نوا ہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام   سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد شد

خاندان قطبی کی دونوں شاخوں میں اتنے اولیا، علما اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں ہوئے ہوں گے، مولانا علی میاں کے جد امجد مولوی حکیم سید فخر الدین خیالی علمی و باطنی کمالات سے مالا مال تھے، فارسی اردو خاص کر بھاشا کے اچھے اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی اکثر تصنیفات تلف ہوگئیں لیکن جو محفوظ رہ گئی ہیں وہ بھی کم نہیں "مہر جہاں تاب" بڑی عجیب اور اہم ہے جس کے حصہ اول کا تیسرا دفتر عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے شاعروں کا تذکرہ ہونے کی بنا پر اردو کے ناقدوں اور محققوں کا بھی مرکز توجہ ہے، ان کے فرزند اور مولانا علی میاں کے پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلما نے عربی میں نزھۃ الخواطر اور الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند اور اردو میں "گل رعنا" یادگار چھوڑیں جو ہمیشہ حوالے اور مرجع کا کام دیں گی۔ مولانا علی میاں کا ننہال بھی علمائے کبار اور اولیائے عظام سے معمور تھا۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است   ایں خانہ تمام آفتاب است

سید محمد فضیل کے فرزند حضرت شاہ علم اللہ حرمین شریفین کے مستقل قیام کے ارادے سے نصیر آباد سے روانہ ہوئے اور رائے بریلی میں جہان آباد پہنچے تو ایک بزرگ مجذوب کے کہنے سے ارادہ تبدیل کر دیا اور جنگل میں دریائے سئی کے کنارے مٹی اور پھوس کا ایک مکان اور مٹی ہی کی

مسجد تعمیر کر کے طرح اقامت ڈال دی، قریب کے ایک گاؤں لوہانی پور کے زمیندار دولت خاں نے پختہ دس بیگھہ زمین نذر کی۔ جو آگے چل کر دائرہ شاہ علم اللہ یا تکیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ شاہ علم اللہ کے بنی اعمام نصیر آباد ہی میں سکونت پذیر رہے، جب یہاں کے مولانا سید عبدالعلی نصیر آبادی کی شادی مولانا سید محمد ظاہر کی جو حضرت شاہ علم اللہ کی پانچویں پشت میں تھے دو صاحبزادیوں سے یکے بعد دیگرے ہوئی تو وہ نصیر آباد سے ترک سکونت کر کے دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی منتقل ہوئے، اسی مقتدر خاندان میں آگے چل کر مولانا علی میاں کی ولادت ہوئی اور دائرہ شاہ علم اللہ یا تکیہ ان کا مولد و منشا بنا۔

بلاد بها تمت علی تمائمی   و اول ارض مس جلدی ترابها

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تسمیہ خوانی تکیہ رائے بریلی میں ہوئی اور مکتبی تعلیم امین آباد لکھنؤ کے محلہ بازار جھاؤلال کی مسجد نوازی کے مکتب میں پائی، یہ محلہ اب محمد علی لین کہلاتا ہے، یہاں ان کے والد کا مکان اور مطب تھا۔ ابھی وہ نو دس برس ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اس لئے اس کو چھوڑ کر تکیہ آنا پڑا مگر جلد ہی ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی سابق ناظم ندوۃ العلما نے بھی اسی محلہ میں اپنا مطب شروع کیا تو ان کو بھی لکھنؤ بلا لیا اور بڑی شفقت اور دل سوزی سے ان کی سرپرستی اور تربیت کی۔ مولانا کو اردو کا اچھا ذوق اور شعر فہمی کی صلاحیت یہیں پیدا ہوئی، انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب اور فاضل حدیث کے امتحانات دئے، اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور سے صرف و نحو کی مشق کی، دار العلوم ندوہ سے استفادے کا آغاز ہوا، مولانا شبلی جیراجپوری سے فقہ اور مولانا حیدر حسن خاں سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، ۱۹۲۹ء میں لاہور کا سفر کیا، مولانا سید محمد طلحہ کے ہم راہ علامہ اقبال اور دوسرے ناموروں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، اگلے برسوں میں پھر جا کر مولانا احمد علیؒ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے طرز تفسیر و فکر کے مطابق قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا، اس طرز میں اس سے پہلے ان کے خواجہ تاش خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ استاد تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی اپنے گھر پر

قرآن شریف کی بعض سورتیں پڑھ چکے تھے، ۳۲ء میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درس حدیث میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، ان سے بعض قرآنی مشکلات میں رہنمائی کے بھی طالب ہوئے۔

برصغیر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عربی کے سب سے ممتاز انشا پرداز اور مصنف تھے۔ اس کی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مولانا خلیل عرب کے گھر پر ہوا اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق بھی یہیں ہوئی، طلبہ کے لئے عربی بولنا لازمی تھا، اردو بولنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں عربی اخباروں اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ لگا جو ان کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی کے یہاں آتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے مطالعہ کا مزید موقع ملا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی دوستی اور رفاقت سے اس ذوق میں جلا پیدا ہوئی، مولانا کے مضامین مصر کے رسالوں میں چھپنے لگے، ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی ندوہ میں ادبِ عربی کے اعلیٰ استاذ ہوکر آئے تو یہاں عربی ادب کے نئے دور کا آغاز ہوا، ان سے مولانا علی میاں نے بھی فائدہ اٹھایا، مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب کی نگرانی اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں مئی ۳۲ء میں الضیاء کا اجرا ہوا جس کے مولانا مستقل مضمون نگار تھے، یہ رسالہ تین سال بعد بند ہوگیا، اس کے تخم سے البعث الاسلامی اور الرائد نکلے جن کے مولانا سرپرست اور نگراں تھے، عربی تحریر و تقریر سے ان کا شغف مدۃ العمر قائم رہا، ۱۹۵۶ء میں وہ دمشق یونیورسٹی کے وزیٹر پروفیسر ہوئے۔ یہاں کی المجمع العلمی کے رکن بھی تھے۔ عربی میں ان کے مضامین و کتب اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ عرب ملکوں کے ہر پروگرام میں مدعو ہوتے تھے اور وہاں کے اکثر اداروں اور انجمنوں کے ممبر بھی تھے، ان سے زیادہ کسی ہندوستانی نے عرب ملکوں کا سفر نہیں کیا، ان کی اردو کتابوں کے عربی ترجمے بھی شایع ہوئے، وہ عرب ملکوں کے موجودہ فضلاء اور اہلِ قلم سے کسی اعتبار سے کم پایہ نہ تھے، اپنی اسی شہرت و

مقبولیت اور دینی عظمت و وجاہت کی بنا پر کلیدِ کعبہ ان کے حوالے کی گئی تھی وکفٰی بہ فخراً۔

مولانا علی میاں نے بیس سال کی عمر حصول تعلیم میں گزاری، ۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں تفسیر و ادب کے استاد مقرر ہوئے، درس تیاری، محنت اور مطالعہ کے بعد دیتے تھے، اس ضمن میں ندوہ کی سفارت، اس کے تعارف اور اس کے مقاصد کی اشاعت کے لئے سفر بھی کیا، ۴۰ء مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور ان کی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں الندوہ پھر جاری ہوا اور فروری ۴۲ء میں بند ہوگیا، دعوتی ذوق کی بنا پر بعد میں بھی صحافت سے دلچسپی رہی، ۴۸ء میں مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کے اشتراک سے پندرہ روزہ اخبار تعمیر نکالا اور اس کے لئے متعدد فکر انگیز مضامین لکھے ہفتہ وار ندائے ملت کے اجراء میں بھی ان کی مساعی شامل تھیں، ان کی سرپرستی میں پندرہ روزہ تعمیرِ حیات شایع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔ ان کو اپنے تدریسی دور میں عربی زبان و ادب کے نصاب کی اصلاح کا خیال ہوا، اس کے لئے مختارات، القرأۃ الراشدۃ اور قصص النبیین وغیرہ خود لکھیں اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے متعدد ریڈریں لکھوائیں، ان کو کورس کی کتابوں کی ترتیب کا خاص سلیقہ تھا، ۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے لئے بی۔ اے کلاس کی ایک کتاب تیار کی جس کا معاوضہ ۵۰۰ روپے ملا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے مبارک باد بھی دی۔ انہوں نے دارالعلوم کے طلبہ میں دینی روح پھونکی اور ندوہ کے مقاصد سے دلچسپی پیدا کی۔ دوسرے دینی مدارس سے اس کا ربط بڑھایا، تبلیغ و دعوتِ دین کے کام سے مولانا کو زیادہ مناسبت تھی، اس میں انہماک بڑھا تو تدریس سے ضابطہ کا تعلق ختم کر لیا، لیکن ندوۃ العلماء سے ان کا خاندانی و موروثی تعلق تھا، اس کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور یہی آیندہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا، ۴۸ء کے وسط میں اس کی مجلسِ انتظامی کے رکن منتخب ہوئے اور جنوری ۴۹ء میں انہیں نائب معتمد بنایا گیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد ۵۴ء میں معتمد ہوئے، ۶۱ء میں اپنے

بھائی ومربی کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء بنائے گئے، ان کے زمانے میں اس کو عالم گیر شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی، علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے ترقی ہوئی، عمارتوں میں بہ کثرت اضافے اور توسیع ہوئی، گوناگوں شعبے اور دفاتر قائم ہوئے، مالی حیثیت سے مستحکم ہوا، مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، پچاسی سالہ جشن منایا گیا، بین الاقوامی سمینار ہوئے، جلسے اجتماعات اور تقریبات آئے دن کا معمول ہو گئے ہیں، غرض انہوں نے ندوۃ العلماء کے چپہ چپہ پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

نعرک ماوارت التراب فعاله   ولکنما واری ثیابا واعظما

ہندوستان اور عالم اسلام کے بے شمار اداروں سے ان کا تعلق تھا، ہر ادارہ ان سے اپنی نسبت کو باعث فخر سمجھتا تھا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے ان کو گہرا اور مخلصانہ لگاؤ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے عقیدت مندانہ تعلق کی بنا پر وہ اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے اور پوری دلچسپی لیتے، اس کی ترقی وکامیابی سے خوش ہوتے، وہ اور ان کے بڑے بھائی اس کی مختلف مجالس کے رکن تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کے بعد ان کو مجلس عاملہ کا صدر بنایا گیا، ان کے، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد وہی اس کے روح رواں تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے، اس کے جشن طلائی اور اسلام و مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار کو کامیاب بنانے میں انہوں نے پوری سرگرمی دکھائی، یہاں سے ان کے والد بزرگوار کی کتاب گل رعنا اور الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کا اردو ترجمہ شائع ہوا، خود ان کی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے شروع کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن یہیں سے نکلا۔ معارف پابندی سے پڑھتے، کسی مہینے میں تاخیر ہوتی تو شکایت کرتے، ابھی حال میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا پسندیدہ رسالہ کون ہے تو جواب دیا معارف۔ دارالمصنفین کو

مالی فائدہ بھی پہنچاتے۔ یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ مسٹر بہوگنا نے ندوۃ العلماء کو ایک لاکھ روپے دیئے تو اسے دارالمصنفین کی طرف منتقل کرا دیا، مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی حصہ ہفتم کا مقدمہ انہوں نے لکھا تھا، یہ کتاب جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بہت پسند آئی اور انہوں نے مولانا کو ایک لاکھ روپے نذر کرنا چاہا تو فرمایا میں اس کا مستحق نہیں۔ دارالمصنفین اور سید صاحب کی بیگم ہیں، چنانچہ نصف نصف رقم دونوں کو ملی، حال ہی میں ابوظبی اور برونائی کی حکومتوں سے ان کو خطیر رقم ملی، اسے انہوں نے مدارس میں تقسیم کر دیا، اس موقع پر بھی دارالمصنفین کا خیال رکھا۔ ان کی سفارش سے اسے رابطہ عالم اسلامی سے ایک اچھی رقم سالانہ ملتی تھی، مگر عرصے سے وہ بند ہوگئی۔

تقریر وتحریر کا ملکہ خداداد تھا، اردو اور عربی دونوں کے ممتاز خطیب اور نامور مصنف تھے، ان کے معاصرین میں ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے تقریریں کی ہوں اور تحریری ذخیرہ چھوڑا ہو، ان کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے اس جوہر کا صحیح استعمال کیا، ان کی ہر تقریر وتحریر کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی ہوتا، ان کی طبیعت کا سوز اور دل کی دردمندی تقریروں اور تحریروں کو اس قدر موثر بنا دیتی تھی کہ ان کو سننے اور پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جاتی تھی، تقریر وبیان پر معجزانہ قدرت کی وجہ سے ۴۳ء میں جب مولانا عبدالسلام قدوائی نے ادارہ تعلیمات اسلام قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام ان پر قرآن مجید اور حدیث شریف کے درس کی ذمہ داری ڈالی تو اس میں لکھنؤ کے تعلیم یافتہ طبقہ، اعلیٰ عہدیداروں اور دین دار مسلمانوں کا بڑا مجمع ہونے لگا، اس خصوصیت کی بنا پر نوعمری ہی میں وہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کے لئے بلائے جاتے اور ندوہ کے نمائندے ہو کر اہم علمی اجتماعات میں مقالے پڑھنے کے لئے مدعو کئے جاتے، ۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی میں شرکت کی اور ۳۸ء میں اس کے پٹنہ کے اجلاس میں شریک ہوئے، ۴۲ء میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کی دعوت پر "مذہب وتمدن" کے عنوان سے

مقالہ پڑھا جو بعد میں کتابی صورت میں چھپا، ادب و انشا سے فطری دلچسپی تھی، اس کا بانکپن ان کی ہر تقریر و تحریر میں نظر آتا، کبرسنی کے باوجود ان کے زور و اثر اور حسن بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سیرت سید احمد شہید، مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، ارکان اربعہ، نبی رحمت، المرتضٰی اور تاریخ دعوت و عزیمت وغیرہ سے اگر ان کی تلاش و تحقیق، کد و کاوش، محنت و دیدہ ریزی، وقت نظر اور نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری تصانیف سے فکر و خیال کی بلندی، رعنائی بیان، زور قلم، تازگی، آمد، روانی اور بے ساختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی تمام تصنیفات کو حسن قبول حاصل ہوا اور جو اردو میں لکھی گئیں ان کے عربی اور عربی کے اردو ترجمے ہوئے، اکثر کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ ان کی عظیم الشان دینی و دعوتی خدمات اور گوناگوں تصنیفات کی وجہ سے ۸۰ء کا فیصل ایوارڈ ملا، یہ اور اس کے بعد کے ایوارڈ سے ملنے والی ساری رقم اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کردی اور اپنے لئے ایک حبہ بھی نہ رکھا۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

مولانا شروع سے محب وطن اور تحریک آزادی کے حامی تھے، انگریزوں سے نفرت کے جراثیم موروثی تھے، ۸ برس کی عمر میں وہ تحریک خلافت کا جوش و خروش اور پھر ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کا وہ منحوس دن دیکھ چکے تھے جب انگریزوں کی سازش سے کمال اتاترک نے بیک جنبش لب اس کا خاتمہ کر دیا تھا، دیوبند کے قیام اور حضرت مدنیؒ کی صحبت نے اس رنگ کو اور چوکھا کر دیا تھا، اپنے تجربہ و مطالعہ سے ایک انگریز ہی کیا سارے یورپ کے الحادی و مادی نظریات کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کے باوجود ان کا اور ان کے گھرانے کا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا، ۴۲ء میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز منظور کی تو ان علماء کے طرز عمل کو پسند کیا جو جنگ آزادی اور استخلاص وطن کی تحریک میں

شریک تھے، مگر آزادی کے بعد جب حکومت کے کارپردازوں کا رنگ بدلا اور مسلمان احساس کمتری اور مایوسی کا شکار ہونے لگے تو وہ جارحیت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، ۶۰ء میں ان کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں ایک ملی اجتماع ہوا جس میں نشان راہ اور لائحۂ عمل تجویز ہوا، یورپ کی سیاسی و تہذیبی تاخت، عقائدی ارتداد اور فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کیا، مشرکانہ عقائد اور دیومالائی تصورات کے انسداد کے لئے دینی تعلیمی کونسل کی رہنمائی کی، مسلمانوں میں نئی دینی، فکری اور جرات مندانہ قیادت کے خلا کو پر کرنے کے لئے ندائے ملت جاری کیا، ۶۴ء میں کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا کے ہولناک فسادات کی سنگینی دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ تمام تعلیمی و تعمیری کاموں سے پہلے اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنے اور اس کو موثر بنانے کے لئے اکثریتی فرقہ کے جانباز اور سرفروش قائدین کو بھی اس میں شامل کرنے کی ضرورت ہے، اسی غرض سے مولانا محمد منظور نعمانی کی معیت میں ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن سے ملے، ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو اس میں سرگرم حصہ لیا، ملک کو زوال اور اخلاقی بحران سے نکالنے اور ہندو مسلم خلیج پاٹنے کے لئے "پیام انسانیت" کی تحریک چلائی، عائلی قوانین کے تحفظ کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی سربراہی کی۔ بابری مسجد کے انہدام پر خون کے آنسو بہائے۔ غرض ان کا بے قرار اور دردمند دل ہر نازک موڑ پر برادران وطن کو درس حقیقت اور مسلمانوں کو شجاعت و عدالت کا سبق پڑھا کر اس کی تلقین کرتا رہا کہ ع معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

مولانا ایک داعی و مصلح تھے، دعوت و عزیمت اور دینی غیرت و حمیت ان کی امتیازی شان تھی، ان کا گھرانا عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کا سختی سے پیرو اور ولی اللّٰہی فکر کا حامل تھا، ان کا محلہ بازار جھاؤلال بھی صحیح العقیدہ لوگوں سے آباد تھا، وہ

شعائر اللہ کی توہین، دین و اخلاق اور انسانیت کی پامالی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسلام کی سربلندی، اصلاح و دعوت اور دین کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ منہمک رہے، ۵۶ء میں ۲۱ برس کی عمر ہی میں ایک موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی کا سفر کیا، وہ عمر بھر مسلمانوں کو مادی تمدن کے دریا کے خلاف تیرنے اور اس کا دھارا موڑنے اور اپنے باطل افکار و خیالات اور غلط رسوم و عادات کی قربانی دینے کے لئے آمادہ کرتے رہے، ندوۃ العلماء میں معلمی کے زمانے میں ان کے ذوق و رجحان میں تبدیلی آئی، اب ان کی پروانہ مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ کسی صالح تحریک و دعوت سے وابستہ ہونے کے لئے فکر مند رہتے، اس زمانے میں وہ مولانا مودودیؒ کے مضامین سے بہت متاثر ہوئے اور چند برس تک حلقہ لکھنؤ کی جماعت اسلامی کے ذمہ دار بھی رہے۔ پھر مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے ان کا ربط و تعلق بڑھا اور عرصہ تک اس میں مشغولیت اور سرگرمی رہی، وہ اپنی اصلاح، تربیت اور تزکیہ نفس سے بھی غافل نہ تھے، اس کے لئے مشائخ و اولیا کی خدمت میں برابر حاضری دیتے، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے، ان کے سوانح اور مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ کا تذکرہ لکھا، چند بار مولانا تھانویؒ سے بھی ملے، مولانا مدنیؒ سے برابر تعلق رکھتے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے اکثر ملتے، مولانا شاہ وصی اللہؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ اور حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں بھی باریاب ہوتے، موخر الذکر کے ملفوظات مرتب کر کے شایع کیا، سیرت و کردار، اخلاق و عادات اور اوصاف و محامد میں اسلاف اور اپنے اجداد کا نمونہ اور اقبال کے مرد مومن کا آئینہ تھے، ان کی کوئی جسمانی یادگار نہ تھی، شادی ۱۹۴۳ء میں ہوگئی تھی، اپنے برادر و خواہر زادگان کو اپنی اولاد سے زیادہ مانتے تھے، معنوی اولاد اور نیازمندوں کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے۔ جن کے غم و اندوہ کا کون اندازہ کر سکتا ہے تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک لمحزونون۔ اللھم صب علیہ شآبیب رحمتک واغفرلہ برحمتک یا ارحم الراحمین۔

مقالات

سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی

اسلامی نقطہ نظر سے وقت کی اہم ضرورت

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی[1]

حسب ذیل مقالہ عروس البلاد قاہرہ میں ۲-۵ جولائی ۱۹۹۸ء کو منعقدہ عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا جو "اسلام اور اکیسویں صدی" کے عنوان پر تھی اور یہ کانفرنس "مجلس اعلیٰ برائے امور اسلامی" کی جانب سے منعقد کی گئی تھی، جو مصری حکومت کی وزارت اوقاف کے ماتحت ہے۔ یہ مقالہ عربی زبان میں تھا جس کا اردو ترجمہ عام افادیت کی غرض سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کانفرنس میں بحث و مباحثہ کے لئے چار موضوعات مقرر کئے گئے تھے، جن میں سے ایک "سائنس کی ترقی میں اسلام کا موقف" تھا اور زیر بحث مقالے کا تعلق اسی موضوع سے ہے، جیسا کہ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا (مترجم: انیس الرحمن ندوی)[2]

انسانی زندگی سے علوم و فنون کا تعلق

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فلاح و سعادت کے لئے اس کو دو قسم کے علوم سے سرفراز کیا ہے۔ پہلا علم شرعی ہے جو اعمال انسانی اور اس کی سرگرمیوں کی حد بندی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اسی علم سے انسان کا اپنے خالق و مالک حقیقی سے صحیح رشتہ و تعلق متعین ہوتا ہے۔ دوسرا علم، علم طبیعی ہے۔ یعنی مظاہر عالم کا علم جس سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے، جیسے نباتات جمادات، حیوانات اور فلکیات وغیرہ۔ علم ثانی کا انسانی زندگی سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ کیونکہ انسان کو

---

[1] ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور [2] رفیق فرقانیہ اکیڈمی۔

اپنی روزمرہ زندگی میں موجودات و مظاہر فطرت سے مفر نہیں، چاہے وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی انسانی زندگی اور انسانی تہذیب و تمدن کا ان موجودات (نباتات، حیوانات اور جمادات) سے براہ راست تعلق ہے اور وہ ان کو قدیم دور ہی سے مختلف صورتوں اور مختلف طریقوں سے برت رہا ہے جس کی وجہ سے قسم ہا قسم کے صنعتی علوم عالم وجود میں آئے اور یہ علوم تفکر و تدبر کی وجہ سے برابر ترقی پذیر ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی برابر ترقی کے منازل طے کر رہے ہیں۔ آج ان علوم نے مختلف میدانوں میں زبردست کامیابیاں حاصل کرلی ہیں جس کی نظیر ازمنۂ قدیم اور یہاں تک کہ گزشتہ صدی تک میں نہیں ملتی۔ آج ماہرین طبیعیات نہ صرف ان اشیاء اور موجودات کو برت رہے ہیں بلکہ ان میں ودیعت شدہ برقی، حرکیاتی، میکانیکی، ایٹمی، شمسی، اشعاعی وغیرہ مخفی طاقتوں کو مسخر کر چکے ہیں اور ان مخفی طاقتوں کی مدد سے بر و بحر کی تسخیر کر کے ان میں پوشیدہ معدنیات و خزانوں اور ان میں ودیعت شدہ فطری و طبیعی منافع سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فضاؤں کو زیر نگیں کر کے انہیں مصنوعی سیاروں سے لیس کر دیا ہے اور اب مشتری و مریخ پر کمند ڈال رہے ہیں۔

یہ طبیعی، تجرباتی و صنعتی علوم اور ان کی مصنوعات جیسے ٹیلی فون، فیکس، ٹی وی، کمپیوٹر، موٹر گاڑیاں، طیارے، راکٹ، خلائی جہاز اور قسم ہا قسم کی مشینیں اور گھریلو، دفتری، طبی، تمدنی اور عسکری ساز و سامان وغیرہ سب ہماری انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہیں، آج کوئی بھی قوم ان مصنوعات کو نظر انداز کر کے ایک دن بھی زندگی گزار نہیں سکتی۔

علوم و صنعتوں کے تئیں اسلام کا موقف

آج یہ تمام علوم اور صنعتیں اقوام کی ترقی کی علامت بن چکی ہیں جو بھی قوم اس میدان میں پس ماندہ رہے گی وہ تمدنی، اقتصادی، تجارتی، عسکری سیاسی، بین الاقوامی اور یہاں تک کہ سفارتی میدانوں میں بھی پچھڑ جائے گی۔ ان علوم اور صنعتوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت ہے۔ اسلام ایک فطری اور مکمل دین ہونے کی وجہ سے حقایق و

واقعات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش قدمی اور ترقی پر ابھارتا ہے۔ اسلام کی یہ ترغیب و تحریص دو میدانوں میں ہے: اول مظاہر عالم میں غور و فکر اور نظام فطرت میں تحقیق و تجسس کرنا اور دوم: اس میں ودیعت شدہ مادی و تمدنی فوائد۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے استفادہ جو کہ مظاہر اور موجودات عالم اور اس کے نظام میں تحقیق و تجسس کرنے والوں کے لئے ایک خدائی تحفہ ہے۔ چنانچہ بطور مثال قسم اول کے سلسلے میں حسب ذیل آیات بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس: ۱۰۱)

کہہ دو دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ (العنکبوت: ۲۰)

کہہ دو کہ ملک میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ اس نے کس طرح مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا پھر اللہ آخری دفعہ بھی پیدا کرے گا۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (الغاشیہ: ۱۷-۲۰)

پھر کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں اور آسمانوں کی طرف کہ کیسے بلند کئے گئے ہیں اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کیسی بچھائی گئی ہے۔

اور قسم ثانی کی تائید میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے

مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ
سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي
الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ
وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ
وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا
تُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ
كَفَّارٌ (ابراہیم : ۳۲-۳۴)

تمہارے کھانے کو پھل نکالے اور کشتیاں
تمہارے تابع کر دیں تاکہ دریا میں اس کے
حکم سے چلتی رہیں اور نہریں تمہارے تابع
کر دیں اور سورج اور چاند کو تمہارے
تابع کر دیا جو ہمیشہ چلنے والے ہیں اور
تمہارے لئے رات اور دن کو تابع کیا
اور جو چیز تم نے اس سے مانگی اس نے
تمہیں دی اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنے
لگو تو انہیں شمار نہ کر سکو بے شک انسان
بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ
الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ
مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔
(الاسراء : ۷۰)

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے
اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور
ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا
اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت
عطا کی۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا
فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ
عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً
(لقمان : ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں
اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اللہ نے
تمہارے کام پر لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی
ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ
شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔
(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا بھی اتارا جس میں سخت
جنگ کے سامان اور لوگوں کے فائدے
بھی ہیں۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم
مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ
وَعَدُوَّكُمْ (انفال : ۶۰)

اور ان سے لڑنے کے لئے جو کچھ (سپاہیانہ)
قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے
جمع کر سکو سو تیار رکھو کہ اس سے اللہ
کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر
ہیبت پڑے۔

نظریاتی و صنعتی علوم | قسم اول کا تعلق خالص نظریاتی علوم سے ہے جب کہ قسم ثانی کا تعلق تجرباتی، تکنیکی اور صنعتی علوم سے ہے۔ اول الذکر سے کائنات اور اس میں موجود عبرتوں اور نشانیوں کے مطالعے سے انسانی فکر روشن ہوتی ہے، جو کہ کائنات کی وحدت اور اس کے پیچھے کارفرما ایک زبردست قوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہی وہ قوت ہے جو کہ کائنات اور مظاہر عالم کو اسباب و علل کے ایک نظام کے تحت چلا رہی ہے جو کہ مافوق الفطرت و مافوق العادت ہے۔ تاکہ انسان کو اذعان کلی ہو جائے کہ اس کائنات کا نظم و نسق از خود وجود میں نہیں آیا اور نہ بنفس نفیس رواں دواں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک پُراسرار ہستی کارفرما ہے جو اسے ایسے حیرت انگیز طریقے سے چلا رہی ہے جس کو انسان ایک ظاہری اسباب و علل کی روشنی میں سمجھ نہیں سکتا۔ لہٰذا انسان کو ایک غیر معمولی طاقت و قوت کا وجود تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، جو خدائے برتر کی ہستی ہے۔ اس اعتبار سے ایک خالق اور خدائے برتر کو ماننے کا عقیدہ قدامت پسندی نہیں بلکہ یہ ایک سائنٹفک نظریہ ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اسلام مظاہر کائنات میں غور و فکر

کرنے اور اس میں پوشیدہ اسرار و حقائق کا جائزہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔

اب رہے تجرباتی وصنعتی علوم تو یہ نظریاتی علوم کے تابع ہیں اور یہ مظاہر عالم میں ودیعت شدہ اسباب وعلل میں غور وفکر اور کائناتی حقائق اور سائنسی اکتشافات کو بروئے کار لانے کا ثمرہ ہیں جو کہ کتاب الٰہی میں موجود آیات الٰہی کی تصدیق کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ	اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے
وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔	نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفسوں
(الذاریات: ۲۰-۲۱)	میں بھی پس کیا تم غور سے نہیں دیکھتے۔
سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي	عنقریب ہم اپنی نشانیاں انہیں دنیا میں
أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ	دکھائیں گے اور خود ان کے نفس میں
الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى	یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔	وہی حق ہے کیا ان کے رب کی یہ بات
(حم السجدہ: ۵۳)	کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں اسلام کی رہنمائی اس اعتبار سے کائنات اور مظاہر عالم میں پوشیدہ خدائی نعمتیں تکنیکی اور صنعتی علوم کے ذریعہ وجود میں لائی جاسکتی ہیں۔ نظریاتی علوم ذہن انسانی کو غلط نظریات اور گمراہ فلسفوں سے بچاتے ہیں، جب کہ صنعتی علوم مظاہر عالم میں پوشیدہ خدائی نعمتوں سے انسان کو آشنا کرکے انسانی تمدن کو آگے بڑھاتے اور اسے ترقی دیتے ہیں۔ تاکہ نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کی آزمائش پوری ہو سکے۔ اسی لئے اسلام عالم انسانی اور بالخصوص مسلمانوں کو کائنات اور موجودات عالم میں غور وفکر کرنے اور ارض وسماء میں ودیعت شدہ بری و بحری منافع جو نباتات، حیوانات، جمادات وسماوات سے متعلق ہیں اور جو ان میں ظاہری و باطنی

نعمتوں کی حیثیت سے پوشیدہ ہیں جیسے برقی، حرکیاتی، ایٹمی، اشعاعی اور شمسی طاقتیں وغیرہ ان سب سے استفادہ کرنے پر ابھارتا ہے۔

تمدنی، صنعتی، اقتصادی، تجارتی اور عسکری میدانوں میں اسلام کے یہ دوٹوک اور واضح احکام ہیں۔ اسی طرح دوسرے تمام علوم اور صنعتوں کی ترقی میں اسلام کی رہنمائی کا یہی حال ہے۔ اس اعتبار سے اسلام انسانی تمدن اور صنعتوں کی ترقی کا پہلا علم بردار ہے۔ لہذا دین اور تمدن میں کسی قسم کا تعارض نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے چنانچہ ایسے لوگ دین کے خلاف بے بنیاد الزام تراشیاں کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام انسان کے تمام دینی و دنیوی مسائل و معاملات میں رہنمائی کرتا ہے اور اس کی ہدایت کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا جیسا کہ دوسرے مذاہب کا حال ہے، لہذا اسلام ہر اعتبار سے ایک مکمل دین ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں نے عہد وسطی میں قرآن مجید کی سائنٹفک اور تمدنی تعلیمات سے فیض یاب ہو کر سائنس اور ٹکنالوجی میں عظیم کامیابیاں حاصل کیں اور اس میدان میں اقوام عالم کی رہنمائی کی اور ان علوم کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا، اسی طرح انہوں نے گراں قدر سائنسی اکتشافات کئے اور بے شمار کائناتی حقائق کو نمایاں کیا۔ ان کے کارہائے نمایاں کا بہت سے اعتدال پسند مغربی فضلاء نے بھی اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ فلپ حتی اپنی مشہور کتاب "تاریخ عرب" میں لکھتا ہے:

"مسلم اسپین نے عہد وسطی کے یورپ کی علمی و فکری تاریخ کا ایک نمایاں باب لکھا۔ آٹھویں صدی کے نصف اور تیرہویں صدی کی ابتداء کے درمیان۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ عربی زبان بولنے والے لوگ ہی ساری دنیا میں تہذیب و ثقافت کے مشعل بردار رہے۔ مزید برآں یہ کہ انہیں کے ذریعہ قدیم سائنس و فلسفہ کی بازیافت ہوئی۔ اس میں اضافہ ہوا اور ان کی

نقل کا کام ایسے طریقے سے عمل میں آیا جس نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی راہیں ہموار کیں۔ اس پورے عمل میں عربی اسپین نے عظیم کردار ادا کیا"۔

Moslem Spain wrote one of the brightest chapters in the intellectual history of medieval Europe. Between the middle of the eight and the begging of the thirteent centuries, as we have noted before, the Arabic-speaking people were the main beraers of the torch of culture and civilization through out the world. Moreover they were the midium through which ancient science and philosophy were recovered, supplemented and transmitted in such a way as to make possible the renaissance of western Europe. In all this, Arabic Spain had a large Share. (1)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے کئی جگہوں پر مسلمانوں کے اس تفوق و برتری کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر "حیاتیات میں عربوں کا تسلط" کے عنوان سے مذکور ہے "یورپ میں سائنس تقریباً ایک ہزار سال تک نیند کے عالم میں رہی، عربوں نے نویں صدی تک اپنا اثر و رسوخ اسپین تک بڑھالیا تھا، وہ سائنس کے محافظ اور نگراں بن گئے، اور حیاتیات میں اپنا تسلط قائم کرلیا جیسا کہ انہوں نے دوسرے علوم میں کیا تھا"۔

Arab domination of biology: during the almost 1,000 years that science was dormant in Europe, the Arabs, who by the 9th century had extended their sphere of influence as far as Spain, became the custodians of science and dominated biology, as they did other diciplines. (2)

بعض تاریخی حقائق

اب تک کی بحث سے بخوبی واضح ہوگیا کہ قرآن عظیم کی مثبت تعلیمات ہی،

عہد وسطی میں مسلمانوں کی ترقی کا محرک بنیں، وہ تجرباتی علوم میں منہمک ہوگئے اور اس میدان میں حیرت انگیز ترقیاں کیں اور جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی۔

یورپ میں یہ دور قرون مظلمہ کا دور تھا، مسلمانوں کی سائنسی میدان میں ترقیاں ہی مغربی اقوام میں حرکت و بیداری کا سبب بنیں اور وہ تحصیل علم اور تسخیر کائنات کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ زمانہ چودھویں اور سولھویں صدی کے درمیان کا زمانہ تھا۔ یہی زمانہ مغرب میں سائنس کے احیاء و ترقی کا دور تھا، جس کو نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا۔ یہ دور مشرق و مغرب کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی اقوام نے ترقی برابر جاری رکھی اور بلاد اسلامیہ کا انحطاط شروع ہوگیا۔ یہ سب مسلمانوں کے فوجی و سیاسی میدان میں شکست و ریخت کا نتیجہ تھا۔ سقوط اسپین اس سلسلے کی آخری کڑی ثابت ہوئی۔ اس حادثہ فاجعہ کے بعد بلاد اسلامیہ پر جمود و تاریکی کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے۔

مذہب اور سائنس میں کشمکش

بہرحال مسلم دور میں سائنس اور ٹکنالوجی میں جو ترقی ہوئی وہ سب دین ابدی کے زیر سایہ تھی۔ اسلامی معاشرے میں یہ علوم کسی بھی دور میں مبغوض نہیں رہے۔ جیسا کہ مسیحی معاشرہ اور بالخصوص کلیسا (چرچ) نے یورپی نشاۃ ثانیہ کے دوران کیا۔ وہاں پر سائنس اور عیسائیت کے درمیان کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جو مذہب اور سائنس کی تفریق کا سبب بنا جس کے سبب الحاد و لادینیت نے جنم لیا، گویا کہ مذہب اور سائنس کے درمیان کوئی رشتہ ہی نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی معاشرے نے مذہب سے بالکل ناطہ توڑ کر مادیت کو گلے لگا لیا۔

جدید تجرباتی علوم کے فوائد

اسی وجہ سے اسلام مذہب اور سائنس یا تمدن اور شریعت میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتا۔ قرآن مجید روئے زمین پر وہ پہلا صحیفہ ہے جو دین اور دنیا کے درمیان

خلیج کو پاٹتا اور اپنے متبعین کو ان کی سعادتوں سے محظوظ ہونے کی دعوت دیتا ہے، تاکہ انسانی زندگی اور انسانی تمدن میں سدھار آسکے تجرباتی علوم کے ان گنت دینی و دنیوی فوائد ہیں۔ اس کے دینی فوائد یہ ہیں کہ نظامِ کائنات اور قوانینِ فطرت کے مطالعہ سے کائنات میں موجود آیاتِ الٰہی کا اثبات ہوتا ہے، جو کہ خدائے ذوالجلال کی وحدانیت، اس کی خالقیت اور اس کی قدرت پر دلالت کرتے ہیں اور اس کے دنیوی فوائد یہ ہیں کہ اس سے مظاہر کائنات میں پوشیدہ خدائی نعمتوں کا سراغ ملتا ہے جو کہ کائنات میں غور و فکر اور قوانینِ فطرت میں تفکر و تدبر کے بعد منکشف ہوتے ہیں۔ اول الذکر سے انسانی اذہان روشن ہوتے ہیں اور گمراہ کن نظریات اور فلسفوں کا ازالہ ہوتا ہے اور آخر الذکر سے قسم ہا قسم کے ایجادات و اختراعات وجود میں آتے ہیں جو کہ تمدن انسانی کو رفتارِ زمانہ کے مطابق ترقی دیتے اور پروان چڑھاتے ہیں۔ یہ تجرباتی علوم فکر انسانی اور تمدن انسانی کی نشو و نما اور اس کی ذہنی بالیدگی میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ لہذا مذہب اور سائنس یا شریعت اور جدید اکتشافات میں کسی قسم کا تعارض نہیں ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری دین ہے اس لئے اس نے نوعِ انسانی کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ اس کی تعلیمات میں کسی قسم کا نقص یا عیب نہیں ہے۔ اسلام کا یہی طرۂ امتیاز ہے جس سے دوسرے ادیان عاری نظر آتے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ کہ مسلمانوں کو شرعی اعتبار سے خلافتِ ارض کے میدان میں پیش رفت کرنے کے لئے یہ علوم نہایت ضروری ہیں۔ کیونکہ دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے یہ علوم سراپا خیر ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال میں ان علوم کا نمایاں کردار رہا ہے۔ موجودہ دور میں ترقی یافتہ قومیں جو ان علوم سے لیس ہیں وہ اس میدان میں غیر ترقی یافتہ اقوام پر رعب و دبدبہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ آج یہ علوم صنعتی و عسکری میدان میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی لئے وہ اقوام جو اس میدان میں پیچھے رہ گئیں وہ رو بہ زوال ہو کر تاریخ کا ایک حصہ بن گئیں۔

تجرباتی علوم اور خلافتِ ارض جدید تجرباتی علوم کا رشتہ خلافتِ ارض سے بڑا گہرا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد آپ کو تمام اشیاء و موجوداتِ عالم سے متعارف کرایا، جیسا کہ ارشاد باری ہے (وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا) مفسرین نے تصریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیائے کائنات کے نام، ان کے خواص و تاثیرات اور ان کے دینی و دنیوی منافع سے متعارف کرایا۔ اس خدائی تعلیم کا راز یہ تھا کہ آپ زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کئے گئے تھے۔ لہذا روئے زمین پر موجود تمام اشیاء و مخلوقات سے آگہی ضروری تھی جو کہ اس کے زیر تصرف آتے ہوں، کیونکہ خلافتِ ارض کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں۔

یہی اسماء و مسمیات یعنی اشیائے کائنات اور اس کے خواص و تاثیرات موجودہ دور میں علوم طبیعی کا موضوع ہیں اور یہی وہ طبیعی علوم ہیں جو جمادات، نباتات، حیوانات، اجرام سماوی اور ان کے طبیعی خصائص (Physical Properties) میں تحقیق و تجسس کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم دیا تھا یہ وہی علم ہے جس کو آج علم طبیعی یا سائنس کہا جاتا ہے۔ اس میدان میں جس نے بھی ترقی کی وہ عروج و ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گیا اور جو پیچھے رہا اس نے ادبار و انحطاط کی پستیوں کو چھو لیا۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو روزِ اول ہی سے یہ علم عطا کیا اور اس واقعہ کو اس کے لئے یادگار اور عزت بخش قرار دیا۔ تاکہ مسلمان اس کو بھول نہ جائیں اور اس سے غفلت نہ برتیں۔ مگر افسوس کہ آج مسلمانوں نے اس کو فراموش کر دیا اور انجان بن گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ طرح طرح کی آزمائشوں اور مصیبتوں سے دوچار ہیں۔ لہذا خلافتِ ارض کے میدان میں جو کچھ ہم نے کھویا ہے اس کو پانے کے لئے ان علوم سے دوبارہ ناطہ جوڑنا ضروری ہے۔ جس کے بغیر خلافتِ ارض کا حصول ممکن نہیں ہو سکتا۔ خلافتِ ارض کی تکمیل روحانیت اور مادیت کے صحیح ملاپ و آمیزش کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی اور جو قوم ان دونوں میں تفریق کرے گی

وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا دین و دنیا کا رشتہ یکساں طور پر قائم رکھنے کے لئے ان دونوں میں تطبیق نہایت ضروری ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کے وہ اقدار و محاسن اور اس کے مثبت پہلو ہیں جو ہر دور میں رہبرانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

امتِ اسلامیہ کا فریضہ

اگر آج امت اسلامیہ ترقی یافتہ ہوتی اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں خود کفیل رہتی تو اس کے اور دوسری اقوام کے درمیان توازن درہم برہم نہ ہوتا۔ بلکہ یہ ایک طرف اگر اقوام عالم کے درمیان عدلِ الٰہی کے قیام کا ذریعہ ہوتا تو دوسری طرف عصری علوم وفنون اور صنعتوں میں سرایت کردہ شر و فساد کی سرکوبی کے لئے مددگار بھی ثابت ہوتا۔ کیونکہ یہ امت ایک بہترین امت بنائی گئی ہے، جس کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی سونپا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ — تم سب امتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ — کے لئے بھیجی گئیں اچھے کاموں کا حکم کرتے
عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰) — ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

لہٰذا علوم وفنون اور سائنس اور ٹکنالوجی کو مفاسد اور خرابیوں سے پاک رکھنا اس امت کا فریضہ ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ امت پوری نوع انسانی کے لئے بھیجی گئی ہے۔ لہٰذا اس کو اچھائی اور خیر کی تعلیم دینا اور اس کو شر اور گمراہی سے روکنا ضروری ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے لامحالہ طور پر "کچھ قوت" کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ ترقی یافتہ قوموں کو مادی طاقتیں ہی زیر کرسکتی ہیں اور ایک بڑی طاقت (Super Power) ہی ان کو اطاعت پر مجبور کرسکتی ہے۔ یہی خلافت ارض کا فلسفہ ہے۔

اس اعتبار سے آج عالم انسانی جن مصائب اور بحرانوں کا شکار ہے وہ سب سائنس اور

ٹکنالوجی میں مسلمانوں کے ادبار و انحطاط کی وجہ سے ہے، لہٰذا یہ صرف امت مسلمہ ہی کا نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کا المیہ ہے۔

خلافتِ ارض کے لئے تسخیر اشیاء کی اہمیت

خلافتِ ارض کے لئے کائنات اور اس میں پوشیدہ مخفی طاقتوں کی تسخیر نہایت ضروری ہے جو کہ خالق کائنات نے نظامِ فطرت میں ودیعت کئے ہیں۔ جیسے بخاری، میکانیکی، برقی، شمسی، ایٹمی اور اشعاعی توانائیاں وغیرہ کیونکہ یہ توانائیاں آج اقوام کی ترقی کی علامت بن چکی ہیں۔ تسخیرِ اشیاء اور تمدنی و عسکری ساز و سامان کی اختراعات و ایجادات کے لئے صنعتی و تجرباتی علوم ضروری ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جس میں عالم اسلام پٹرول، معدنیات، زراعت اور دوسری بیش بہا خدائی نعمتوں پر دسترس رکھنے کے باوجود بہت پیچھے ہے۔ آج صنعت و ٹکنالوجی کے میدان میں عالم اسلام کے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے اقوام عالم مسلمانوں کے قدرتی خزانوں کو لوٹ رہی ہیں اور اپنی من مانی کر رہی ہیں گویا کہ یہ سب مالِ غنیمت ہے۔

پٹرول کی اہمیت اور اس کا استحصال

واقعہ یہ ہے کہ جدید صنعتوں میں پٹرول کی بہت بڑی اہمیت ہے جو کہ بلاد اسلامیہ اور بالخصوص بلاد عربیہ کے زیر تسلط ہے۔ نیز یہ کہ پٹرولیم کی مصنوعات (پٹروکیمیکلس) میں پٹرول کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ یہ کیمیائی مصنوعات صرف پٹرول اور گیس سے تیار کی جاتی ہیں جو کہ موجودہ دور میں جدید مصنوعات اور عالمی اقتصادیات میں شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو موٹر گاڑیوں، طیاروں اور دوسری بڑی مشنریوں کو چلانے میں مرکزی اہمیت کی حامل ہیں۔ پٹرول اور گیس کا استعمال ان گنت مصنوعات اور قسم ہا قسم کی اشیاء تیار کرنے کے لئے وسیع پیمانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جیسے پلاسٹک، ڈٹرجنٹس، دوائیاں کیمیائی کھاد، مصنوعی ریشم، حشرات کش مواد، ربڑ، خوشبوئیات، دھماکہ خیز مواد، چکنائی والے مادے، موم بتیاں، رنگ و روغن کی اشیاء، ایندھن اور الکوحل مواد وغیرہ۔ اس اعتبار سے آج پٹرولیم

کیمیائی صنعت کے لئے شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے، جس پر متمدن دنیا کا دار و مدار ہے۔ آج اسلامی ممالک پٹرول، گیس، معدنیات اور دوسرے طبیعی پیداوار کے عظیم الشان ذخائر کے مالک ہیں، جو کہ غیروں کو نصیب نہیں ہیں، یعنی دنیا کے دو تہائی ذخیروں پر آج عالم اسلام کا قبضہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ پٹرول آج تقریباً تمام کیمیائی مصنوعات اور جدید ٹکنالوجی میں اولین اہمیت کا حامل ہے اور یہ مصنوعات تمدنی، تجارتی، اقتصادی، عسکری اور یہاں تک کہ سیاسی، بین الاقوامی اور سفارتی میدانوں میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پٹرول آج اقوام عالم کے درمیان جنگ وجدال اور قتل و غارت گری کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس اعتبار سے عالم اسلام آج جنگی میدان بن کر رہ گیا ہے اور وہ روز بروز تیسری جنگ عظیم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا واضح اور بین سبب پٹرول ہے جو عالم اسلام کے قبضے میں ہے، یہی وہ اسباب ہیں جنھوں نے ترقی یافتہ اقوام کو ان ذخائر پر قابض ہونے کے لئے مزاحمت و مسابقت اور باہم جنگ و جدل پر اکسایا ہے اور جس کے حصول کی خاطر وہ بعض اقوام کو بھینٹ چڑھا چکے ہیں تاکہ بلاد عربیہ پر ان کا شکنجہ مضبوط ہوسکے اور ان کو باہم جنگ وجدال میں ملوث کرکے ان میں عداوت اور دشمنی کو بڑھاوا دے سکیں۔ مغربی قوموں کی یہی وہ مکاریاں ہیں جن کو وہ مسلمانوں کے ذخائر کو ہتھیانے کے لئے اپنا رہی ہیں۔ عالم عربی اور عالم اسلام اپنی سادگی اور جدید علوم و ٹکنالوجی پر دسترس نہ رکھنے کی وجہ سے ان معاملات میں عموماً دھوکا کھا جاتے ہیں، مسلمانوں کے لئے موجودہ دور میں یہ سب سے بڑی آزمائش ہے، جو کہ عربوں اور مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے۔

آج معاملہ نہایت سنگین شکل اختیار کرچکا ہے۔ جب تک مسلمان خود اپنی قدر و قیمت نہیں پہچانتے اور اقوام عالم کے درمیان اپنی صحیح حیثیت تسلیم نہیں کرواتے تب تک حالات بدل نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بلند مرتبہ عطا کیا ہے اور ان کو ظاہری و باطنی نعمتوں سے سرفراز

فرمایا ہے اور دوسروں کی طرح ان کو بھی مرد بنایا ہے۔ لہذا اگر وہ حالات کو بدلنے اور سائنس و ٹکنالوجی اور صنعت و حرفت میں پیش قدمی کا عزم مصمم کرلیں تو وہ غیر قوموں کو اپنے بیش بہا ذخائر کی لوٹ سے روک سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ اقوام کے چنگل سے نکلنے اور سنگین خطروں سے بچنے کے لئے ان معروضات پر فوری عمل درآمد ضروری ہے۔ اسی طرح ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جامع منصوبوں کی اشد ضرورت ہے۔ خلافت ارض اور اس کے تقاضوں سے مکمل طور پر دست برداری ہرگز جائز نہیں ہے۔ یہ کار خلافت اگرچہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔

ایک جامع منصوبہ یہ وہ صورت حال ہے جو آج عالم اسلام کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ حریت و آزادی سے جینے کے لئے مغرب کے پنجوں سے چھٹکارا نہایت ضروری ہے۔ جس کے لئے ایک جامع منصوبے اور پلاننگ کی ضرورت ہے۔ لہذا اس سلسلے میں چار بنیادی کارروائیاں ضروری ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پوری سنجیدگی اور جدت کے ساتھ پیش قدمی اور ترقی کی جائے۔

۲۔ اس عظیم کام کے لئے مطلوبہ وسائل کی فراہمی اور اس کی مالی اعانت کی جائے۔

۳۔ عالم اسلام کے تمام مسائل کے حل کے لئے ایک جامع منصوبے اور پلاننگ اور سائنسی، تمدنی، صنعتی اور عسکری میدانوں میں ترقی کے لئے حکمت عملی وضع کرنا ضروری ہے۔

۴۔ عالم اسلام کو ایک سیاسی وحدت کی طرح متفق و متحد ہونا ضروری ہے۔

یہی وہ چار عناصر ہیں جو اس میدان میں مسلمانوں کی کامیابی اور ان کی فلاح و بہبود کے ضامن ہیں۔ لہذا ایک حکمت عملی کی اشد ضرورت ہے۔ اس میدان میں ایک بنیادی منصوبہ بندی اور تدبیر کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ بہرحال موجودہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ

تمام مسلمان عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی طرف بطور پیش رفت ایک تاریخی عمل کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔

عالم اسلام کا اتحاد وقت کی اہم ضرورت آج روئے زمین پر پچاس سے زائد اسلامی ممالک موجود ہیں۔ جن کی اپنے طبیعی وفطری اور جغرافیائی کی حیثیت سے کئی قسمیں ہیں؛ ان میں سے بعض اپنی قدرتی پیداوار، معدنیات اور زراعت وغیرہ سے مالا مال ہیں، بعض سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ایک حد تک جانکاری رکھتے ہیں اور بعض اقتصادی ومالی حیثیت سے مضبوط ہیں۔ اگر یہ تمام ممالک ایک مشترکہ پروگرام اور ایک منصوبے کے تحت باہم تعاون واشتراک کریں تو مسلمانوں کے موجودہ مسائل ومشکلات حل ہوسکتے ہیں۔ اس طرح کا کوئی بھی اقدام ان کی اکثر ضروریات میں ان کو خود کفیل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے اور وہ عالم اسلام کی مشترکہ منڈی کے قیام کے لئے راہیں ہموار کرسکتا ہے۔ الغرض عالم اسلام دھیرے دھیرے ترقی کے منازل طے کرسکتا ہے۔

اس طرح کے اقدامات کے ان گنت منافع وفوائد ہیں، جن میں تمدنی، صنعتی، اقتصادی اور تجارتی وغیرہ تمام مشکلات کا حل پوشیدہ ہے اور اس طرح کے اقدامات عالم اسلام سے افلاس وغربت اور بے روزگاری وجہالت کا خاتمہ کرسکتے ہیں اوران اقدامات کے ذریعہ ایک خوش حال، تعلیم یافتہ، متمدن اور باسعادت دور کی آمد آمد ہوگی جو مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے، غیروں پر تکیہ نہ کرنے اور ان میں حقیقی اتحاد اور اخوت وبھائی چارگی کو قائم کرنے کا سبب ہوگی۔ لہذا یہ عمل مسلمانانِ عالم کے درمیان اخوت وبھائی چارگی قائم کرنے کے لئے حجرِ اساسی ہوگا۔

خلافتِ ارض کے فرائض اب تک کی بحث میں ان شرائط اور خوبیوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

جو کہ خلافتِ ارض کی بازیافت کے لئے ضروری ہیں۔ خلیفہ وہ کہلاتا ہے جو اپنی سرزمین اور اپنے علاقے میں موجود تمام اشیاء ومظاہر پر دسترس رکھتا ہو۔ لہذا وہ خلیفہ نہیں ہوسکتا جو ارض وسماء میں موجود اشیاء اور موجودات کو برتنے اور اس سے مستفید ہونے پر قادر نہ ہو، وہ اشیاء اور موجودات جن کو خالقِ کائنات نے انسان کے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (ابراہیم: ۳۲-۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے تمہارے کھانے کو پھل نکالے اور کشتیاں تمہارے تابع کردیں تاکہ دریا میں اس کے حکم سے چلتی رہیں اور نہریں تمہارے تابع کردیں اور سورج اور چاند کو تمہارے تابع کردیا جو ہمیشہ چلنے والے ہیں اور تمہارے لئے رات اور دن کو تابع کیا اور جو چیز تم نے اس سے مانگی اس نے تمہیں دی اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو نہیں شمار نہ کرسکو۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔ (لقمان: ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے کام پر لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی ہیں۔

امام راغب نے لکھا ہے کہ "تسخیر کا مطلب ایک مخصوص غرض وغایت کی طرف زبردستی کسی شئے کو لے جانا ہے"۔

التسخیر سیاقہ الی الغرض المختص قہراً۔ ای سوق الشئ قہرا الی غرض معین واسوا المفعول مسخر وھی مسخرۃ۔

قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ "اللہ نے ان کو تمہارے فائدے اور تصرف کے لئے تیار رکھا ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان اشیاء کی تسخیر کا مطلب ان کو برتنے کی کیفیت سکھانا ہے"۔

نجعلھا معدۃ لانتفاعکم وتصرفکم وقیل تسخیر ھذہ الاشیاء تعلیم کیفیۃ اتخاذھا۔

لہذا تسخیر موجودات (یعنی اشیائے عالم میں پنہاں مادی منافع کے حصول کے لئے) عالم اسلام کو حسب بالا ایجابی اقدامات کرنے ضروری ہیں

قوموں کے انقلاب میں ثابت قدمی کی اہمیت

خلاصہ یہ کہ اس قسم کے ایجابی اقدامات ہی تسخیر اشیاء اور خلافت ارض کے میدان میں ترقی وکامیابی کے ضامن ہیں جو امت اسلامیہ میں خود اعتمادی اور اس میں اپنے دین وایمان کے تئیں احساس برتری پیدا کر سکتے ہیں، اسی وجہ سے ارشاد باری ہے:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ	تو کہہ دے اسے تیرے رب کی طرف سے
لِيُثَبِّتَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ	پاک فرشتے نے سچائی کے ساتھ اتارا ہے
بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ	تاکہ ایمان والوں کے دل جما دے اور
(النحل: ۱۰۲)	فرماں برداروں کے لئے ہدایت اور
	خوش خبری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ تَنْصُرُوا	اے ایمان والو اگر تم اللہ تعالیٰ کی مدد
اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ	کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور
(محمد: ۷)	تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔

اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے امت کو اسی قسم کے استقلال اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے جو دین اسلام کو مستحکم اور ان کی اجتماعی زندگی سے دشمن کے خوف کا ازالہ کردے۔ موجودہ سنگین صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم امت کی فلاح وبہبود اس کے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی اور حالات کے سدھار کے لئے ایک منظم طریقے سے ٹھوس اقدامات کریں جو قرآنی روح کے عین مطابق ہوں، یہاں تک کہ ہم سچائی وحقیقت کے ایک بلند معیار کو چھولیں اور ایک ایسا ماحول پیدا کریں جو امت اسلامیہ اور دین ابدی کو سربلندی سے ہمکنار کرسکے۔

اسلام کی ہمہ جہت رہنمائی

الغرض اگر ہم اسلامی اصولوں اور عصری تقاضوں کے درمیان بغیر کسی رخنہ اندازی کے تطبیق دیں تو ہم بڑے خوش نصیب ہوں گے جیسا کہ مذکورہ بالا مباحث سے واضح ہوگیا کہ اسلام سائنس وٹکنالوجی، تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کی ترقی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکاتا، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوگیا ہے۔ اس کے برخلاف وہ عزلت وگوشہ نشینی کی مخالفت کرتے ہوئے عروج وترقی کی دعوت دیتا ہے، جیسا کہ اس پر کتاب اللہ کے منصوص اور واضح بیانات شاہد ہیں۔

لہذا اسلام کو ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کا حاکم اعلیٰ ماننے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے، جو کہ ہمارے افکار وعقائد اور زندگی کے تمام مظاہر کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کتاب وسنت کا کوئی بھی منصوص بیان مسلمانوں کو تہذیب وتمدن کے میدان میں ترقی سے باز نہیں رکھتا اور نہ ہی اسلام عیسائیت کی طرح دنیوی زندگی اور تمدن کی تحقیر کرتا ہے۔

نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی میں عیسائیت کی ناکامی کا یہی بنیادی سبب ہے جس کو مغربی اقوام نے بالکل رد کر دیا۔ اس کے برعکس اسلام تہذیب و تمدن کی ترقی کی راہ میں مسلمانوں کی پوری ہمت افزائی کرتا ہے، کیونکہ اس میدان میں ترقی سے خود دینِ ابدی کی حفاظت مطلوب ہے۔ اسی طرح اس سے اسلامی معاشرے کو اجنبی تہذیب و تمدن کے سامنے جھکنے سے روکنا بھی مقصود ہے، جس کے باعث وہ مذہب مخالف رجحانات کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اپنی ہمہ جہت رہنمائی میں دوسروں سے ممتاز ہے، وہ اپنے متبعین کو احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا جو فکری انحطاط کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے کے ذہنی انتشار سے حفاظت کے لئے مذہب و تمدن میں کامل موافقت نہایت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے وہ دین و دنیا اور شریعت و تمدن میں تفریق نہیں کرتا، کیونکہ وہ ہر اعتبار سے ایک کامل دین ہے اور تمدنی ارتقا ہمیشہ قرآن کے زیرِ سایہ رہنا چاہئے۔ یہی اس کی ہمہ جہت رہنمائی ہے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے تقاضے اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں خلیفہ بنا کر پیدا کیا اور اس کو اس نے علمِ اشیاء عطا کیا، تاکہ وہ دینِ ابدی کو قائم کرے اور منحرف مذاہب و فلسفوں پر اتمامِ حجت کا فریضہ انجام دے سکے۔ اس لحاظ سے جو بھی قوم اس علم کے حصول میں کوتاہی کرے گی اسے سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہی وہ سبق ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں پوشیدہ ہے، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔

خلافتِ ارض کے دو پہلو ہیں، ایک روحانی اور دوسرا مادی۔ خلافت کی تکمیل کے لئے ان دونوں میں مطابقت ضروری ہے۔ ان میں تفریق سے توازن بدل جائے گا۔ مسلمان آج خلافت کے میدان میں صرف روحانی پہلو کے مالک ہیں، جب کہ مغربی اقوام صرف مادی پہلو کے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ان دونوں کے ملاپ اور تطبیق ہی سے برپا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ خلافتِ ارض ہے

جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی دوبارہ بحالی اور اسلامی عظمت کے دوبارہ حصول کے لئے ان دونوں میں کامل مطابقت ضروری ہے۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اسلامی ممالک اور اس کے مختلف محاذوں میں تال میل ضروری ہے جو کہ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد و بھائی چارے کا متقاضی ہے۔ یہی قرآنِ مجید کی تعلیمات کا خلاصہ اور تمام مسلمانوں کے لئے اس کا پیغام ہے۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ (المومنون: ۵۲)

اور بے شک یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں، پس مجھ سے ڈرو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آلِ عمران: ۱۰۳)

اور سب مل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (الانفال: ۴۶)

اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (الانعام: ۱۶۵)

اس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا ہے اور بعض کے بعض پر درجے بلند کر دئے ہیں تاکہ تمہیں اپنے دئے ہوئے حکموں میں آزمائے، بے شک تیرا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک البتہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: ۱۴)

پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو؟

مراجع

(1) History of Arabs, Philip K. Hitti. P. 557, London. 1977.

۲؎ (2) Encyclopaedia Britannica, Vol. 2. P. 1018, 1983. ۳؎ تفسیر

جامع البیان فی تفسیر القرآن: طبری، ۱۰/۱۷۰، تفسیر القرآن العظیم: ابن کثیر ۱/۷۳، تفسیر الکشاف للزمخشری

۱/۳۲، تفسیر کبیر، رازی ۱/۱۹۳، احکام القرآن' جصاص: ۱/۳۱، تفسیر منار، رشید رضا: ۱/۲۹۲

۴؎ تفصیل کے لئے مندرجۂ ذیل کتب سے رجوع کیا جائے (1) Encyclopaedia Britannica, Vol. 14. P. 180, 1983. (2) The World Book Encyclopaedia Britannica. Vol. 15. P. 328, London. (3) Chemistry Today, P. 66, World Book inc. Chicago ۵؎ المفردات فی غریب القرآن، ۳۳۲، بیروت ۶؎ معجم الفاظ القرآن الکریم

۱/۵۷۸، مجمع اللغۃ العربیۃ، ۱۳۹۰ھ ۷؎ تفسیر البیضاوی: ۳/۳۵۰، دار الفکر بیروت ۱۴۱۶ھ

مولانا ابوالکلام آزاد اور عربی

از ڈاکٹر محمد نعمان خاں*

مولانا ابوالکلام آزاد کی مادری زبان عربی تھی اور ان کی ابتدائی پرورش بھی کسی حد تک عرب ماحول میں ہوئی، کیونکہ ان کے والد مولانا خیرالدین اپنے نانا کے ساتھ ہجرت کرکے حجاز چلے گئے تھے، جہاں مولانا خیرالدین کے ایک استاد شیخ محمد ظاہر وتری نے ان کی شادی اپنی بھانجی سے کردی تھی، مزید یہ کہ مولانا آزاد کی ایک بیوہ خالہ بھی انہی کے گھر میں رہتی تھیں جو ہندوستانی زبان کو پسند نہیں کرتی تھیں، وہ مولانا کے والد سے ہمیشہ شکوہ بلب رہتی تھیں اور کہتیں: "تم ہندوستانی زبان بول کر ہمارے بچوں کو خراب کردوگے"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ننہال بھی پڑھے لکھے ماحول کا تھا، ان کی والدہ بڑی اچھی مقررہ اور واعظہ تھیں، رمضان مبارک میں اچھے گھرانے کی عورتیں ان کے گھر آجاتی تھیں اور وہ تراویح کے بعد سحری تک خطبہ دیا کرتی تھیں اسی طرح مولانا کی نانی بھی خوش لحان قاریہ تھیں۔

لیکن اس کے باوجود مولانا کا ماحول خالص عرب ماحول نہ تھا، بلکہ اردگرد ہندوستانیوں کا جال بھی بچھا تھا، جن میں غالباً بنگالی زیادہ تھے اور وہ بنگالی، ہندوستانی یا اردو میں بات چیت کرتے تھے اور خود مولانا کے والد اردو میں بات چیت کرتے تھے لیکن وہاں کی اردو پر مقامی اثر تھا، جس کی وجہ سے بعض الفاظ میں غلطی کرنے کی عادت مولانا کو بھی ہوگئی تھی جس کا ازالہ بڑی مشکل سے ہوا، اس سلسلے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا سے نقل کیا ہے۔

"عربی زبان ہم لوگوں کے بچپن میں گویا گھر کی زبان تھی، میری بہنیں تو ٹھیک سے اردو بول بھی نہیں سکتی تھیں، بڑی اور منجھلی بہن تو اکثر عربی ہی میں بات چیت کرتی تھیں، بچپن کا

---

* صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی۔

ابتدائی زمانہ مکہ معظمہ میں ایسا گزرا کہ گھر میں اردو میں بات چیت تو ہوتی تھی لیکن والدہ مرحومہ کو اس درجہ اردو زبان اور اردو بول چال ناپسند تھی کہ والد سے بھی وہ کبھی کوئی بات اردو میں نہ کہتی تھیں، تھوڑی تھوڑی وہ اردو سمجھنے لگی تھیں لیکن بول بالکل نہیں سکتی تھیں، والد صاحب مرحوم ہم لوگوں سے اردو میں باتیں کرتے اور سکھاتے، دو تین[۳] شخص باہر بھی ہندوستانی ایسے تھے کہ جو ہمیشہ گھسے رہتے تھے۔ گھر میں جن لوگوں سے پڑھنا شروع کیا وہ بھی ہندوستانی تھے اس لیے اردو بھی ہم بولنے اور سمجھنے لگے تھے، اگرچہ وہ صحیح نہ ہوتی تھی، عرصے تک بہت سے اردو کے غلط الفاظ اور غلط مخارج جو عرب بولتے تھے میری زبان پر رہے اور میں نے بتدریج کوشش کرکے دور کیا۔"

مولانا تقریباً سات آٹھ سال کی عمر تک مکہ مکرمہ میں رہے، اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں کلکتے آمد ہوئی اور سال بھر بعد ہی مولانا کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا اور عرب ماحول خواب کی سی بات بن کر رہ گیا، مکہ سے روانگی سے قبل مولانا نے ناظرہ قرآن مجید مکمل کرلیا تھا اور سورۂ یٰسین اور سورۂ ق حفظ کرلی تھیں اور قرأت کے لیے حرم شریف میں شیخ القراء شیخ حسن کے پاس جانا شروع کردیا تھا، اسی دوران اردو کے حروف تہجی سیکھ لئے تھے۔

مولانا کو بچپن کے مکی ماحول کی وجہ سے عربی سے مناسبت ہوگئی تھی، اگرچہ سیکھی بول چال کی رائج زبان ہی تھی، چنانچہ کہتے ہیں: "ان اسباب سے ہم لوگ بچپن ہی سے حجاز کی غلط اور محرف عربی بولنے کے عادی ہوگئے تھے، اس کا اثر یہاں تک رہا کہ جب عربی پڑھنے لگے اور تراکیب سے واقفیت ہوگئی جب بھی گفتگو میں بے اختیار وہ الفاظ منھ سے نکل جاتے تھے، تاہم اس سے بلاشبہ عربی کی تحصیل میں ہمیں مدد ملی اور عدم مناسبت پیش نہ آئی جو غیر مانوس زبان کے پڑھنے میں رکاوٹ ڈالا کرتی ہے بلکہ ہمیں یہی معلوم ہوا کہ گویا ہم اپنی مادری زبان پڑھ رہے ہیں۔"

مولانا کی عمر جب آٹھ نو برس کی تھی اس وقت بھی وہ قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر اچھی طرح بیان کرلیا کرتے تھے، مولانا اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "میں قرآن کا مطلب اس لئے سمجھتا تھا کہ قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھایا گیا تھا، گو التزام کے ساتھ پورا نہیں ہوا تھا۔"

مولانا کے والد کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کی اولاد کہیں جاکر پڑھے، اس لئے ان کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اس زمانے میں درس نظامیہ ہی کا رواج تھا، مولانا کی نظامی تعلیم اسی طریقہ تعلیم کی رہین منت ہے۔ مولانا نے رائج الوقت نصاب کے مطابق فارسی، عربی اور معقولات وغیرہ کی کتابیں پڑھیں ان کے والد کے ذہن میں بھی ایک نصابی خاکہ تھا، اس کے مطابق کچھ کتابیں زائد اور کچھ کتابیں جو درس نظامی میں مکمل نہیں پڑھائی جاتی تھیں، مکمل پڑھائیں یا پڑھوائیں، چنانچہ مولانا نے مائۃ عامل، کنز الدقائق، شرح التہذیب، ایساغوجی، شرح وقایہ، ہدایہ اول، ہدایہ آخرین کا کچھ حصہ، مشکاۃ، جلالین، قطبی، شرح ملا جامی، میبذی، ہدایۃ الحکمۃ، مختصر المعانی، مطول، شمس بازغہ[۱]، رشیدیہ، میر زاہد، تفسیر بیضاوی، ملا جلال، سکاکی کی مفتاح العلوم، شرح نخبۃ الفکر، مقامات وغیرہ پڑھیں۔ وہ زمانہ علمی ہمہ گیری کا تھا، اس لئے طب بھی شروع کرائی گئی، لیکن مولانا کی طبیعت اس طرف مائل نہ ہوسکی۔

ان کتب کے علاوہ ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر والد نے پڑھائی تھی، اگرچہ پوری نہیں ہوئی تھی، اس کے علاوہ فتح القدیر، عینی: شرح ہدایہ، بحر الرائق، شرح سفر السعادۃ از شیخ دہلوی، عینی علی الکنز، جواہر نیرہ شرح قدوری، شرح معانی الآثار، منار کی تمام شرحیں، تفسیر احمد ملا جیون اور بہت سی شرحیں وغیرہ دیکھتے اور جو مشکلات پیش آتیں اساتذہ سے حل کرلیتے۔

۱؎ یہ کتاب مولانا کو سب سے پہلے ان کے استاد مولانا نذیر الحسن امیٹھوی جو مولانا عبد الحق خیر آبادی کے شاگرد تھے نے دکھائی اور بلاغت سے متعلق مقالہ پڑھایا۔

مولانا کی جن درسی کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ عموماً سب کی سب عربی میں ہیں۔

مولانا نے نواب صدیق حسن خاں کی بھی تمام تصانیف کا مطالعہ کیا تھا، اسی طرح شاہ ولی اللہ کی عقد الجید، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، حجۃ اللہ البالغۃ، بدور بازغۃ، تفہیمات الٰہیہ وغیرہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا عبد الرحیم جوہری [عام زبان میں دہریہ کے نام سے جانے گئے] ان کی عربی کتاب جامع العلوم کا بھی مطالعہ کیا جو انہوں نے ریاضیات سے شروع کی تھی۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے علامات یا رموز اوقاف وقرأت کا استعمال کیا تھا۔

ساتھ ہی شیخ محمد عبدہ کی کتاب التوحید اور ان کے دیگر مضامین پڑھ چکے تھے، المنار تو ان کا پسندیدہ جرنل تھا، اس کے علاوہ دیگر علماء مثلاً محمد صدر الدین قازانی وغیرہ کے علمی کارناموں سے خوب واقف تھے، معتزلہ کی طرف ذہنی رغبت ہوجانے کی وجہ سے ان پر لکھنے کی تحریک ہوئی تو اس موضوع پر گہرا مطالعہ کیا اور مواد جمع کرنا شروع کیا، یہ سب مواد عربی میں تھا۔ الشریف الرضی کی کتاب الامالی پڑھی اور قاضی عبد الجبار کی کسی کتاب کا مطالعہ کیا، جس کا نام لکھنے سے رہ گیا ہے[1]۔

اس کے علاوہ ابوبکر یحییٰ کی الملل والنحل (تا باب المعتزلہ والاعتزال) مقریزی کی تاریخ مصر، رازی کی تفسیر کبیر، امام ابن حزم کی المفصل، شہرستانی کی الملل والنحل، شہرزوری اور القفطی کی تاریخ الحکماء کا مطالعہ کیا، نیز تفسیر وعقائد کی دیگر کتابیں جن میں رد کے لئے معتزلہ کے اقوال کا ذکر ہے، سب کا احاطہ کیا، ابن رشد کی کشف الادلۃ کا بھی مطالعہ کیا۔

مولانا کو مطالعے کا شوق شروع ہی سے تھا، وہ بھی غیر درسی مطالعے کا، کیونکہ درسی کتب سے تو وہ جلد ہی فارغ ہولیا کرتے تھے، کہتے ہیں: "ذہن وحفظ کی وجہ سے صرف درس اور قبل درس مطالعہ کفایت کرتا"، اس لئے باقی وقت خارجی مطالعے میں صرف کرتے، چونکہ یہ مطالعہ

[1] ممکن ہے ان کی مشہور کتاب تنزیہ القرآن عن المطاعن ہو جو ۱۹۰۸ء میں قاہرہ سے شایع ہوچکی تھی" ن"

متنوع ہوتا تھا اس لئے وہ مختلف جگہوں پر اپنے اس شوق کو پورا کرنے جاتے، مولانا ضیاء الرحمن نے کلکتے میں کتابوں کی دکان کھول رکھی تھی جہاں مولانا جاکر عربی، فارسی اور اردو کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور جو خرید سکتے خرید تے۔

مولانا آزاد مولانا محمد شاہ رام پوری سے جب وہ ۱۹۰۱ء میں ندوہ کے اجلاس کے دوران کلکتے آئے متعارف ہوئے، ان کی سادہ اور دل کو لگنے والی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور خارجی طور پر ان سے ڈیڑھ ماہ تک ترمذی شریف کا درس لیا۔

اسی دوران وہ امام غزالی کی تصانیف سے متعارف ہوئے، المنقذ من الضلال کا مطالعہ کیا، پھر تہافت الفلاسفہ، ابن رشد کا رد اور خواجہ زادہ کا محاکمہ جو بمبئی سے مجموعے کی شکل میں شایع ہوا تھا منگا کر پڑھا، تہافت الفلاسفہ کا ترجمہ بھی شروع کیا، مگر نصف کے بعد بے سود نظر آنے لگا چنانچہ دست بردار ہوگئے۔

عربی تو گویا گھر کی رکھیل تھی، اس لئے اس کے برعکس مولانا فارسی کے حصول میں زیادہ سرگرداں رہے اور مولانا کے والد نے بھی اس طرف توجہ زیادہ دی، مولانا ایرانیوں اور فارسی زبان کے علماء کی تلاش میں رہتے، ان سے گفتگو کا موقع نکالتے اور ان کے ساتھ تحریری مشقیں کرتے، ان میں بعض عربی داں بھی ہوتے لیکن مولانا کا مرکز توجہ ان کی فارسیت ہوتی مولانا کو چونکہ معقولات سے بے حد دلچسپی تھی اس لئے جب ایک ایرانی علامہ سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان سے مولانا کو بہت علمی فائدہ ہوا، ان کے بارے میں کہتے ہیں:

"پہلی مرتبہ جب بمبئی گیا تو وہاں اس [یعنی ایرانی علماء سے استفادے] کا زیادہ بہتر موقع ملا، وہاں شرفائے ایران کی ایک اچھی جماعت ہمیشہ رہتی ہے، اتفاق سے اس زمانے میں شیخ الرئیس نامی ایران کے عہد حاضر کے ایک استاذ علوم آغا خاں کے مہمان ہوئے

شیخ الرئیس ان کو مظفر شاہ نے لقب دیا تھا، فارسی، عربی اور قدیم معقولات میں وہ بے نظیر تھے، شرح حکمۃ الاشراق کے پڑھنے کا انہوں نے مجھے مشورہ دیا اور میں نے انہی سے شروع کی، عربی میں اتنی فصیح و بلیغ تقریریں برجستہ کرتے تھے کہ میں نے عربوں کی زبانی بھی ایسی نہیں سنیں، نہج البلاغہ کی انہوں نے ایک شرح لکھی ہے جو ایران میں چھپ گئی ہے، ان سے تقریباً سال بھر روزانہ صحبت رہی اور مجھے عربی، فارسی، معقولات، معلومات عامہ اور بہت سی باتوں میں ان سے فائدہ ہوا اور بلاشبہ ان کے مجھ پر حقوق ہیں"۔

اسفار اربعہ، عبدالرزاق لاہیجی کی تصانیف و شروح پر مولانا نے انہی سے درس لئے، اس موضوع کی بعض کتابیں جن کے چھپ جانے کا علم علامہ شبلی وغیرہ کو بھی نہیں تھا، مولانا نے ان کے پاس دیکھیں اور پڑھیں، جن میں امام رازی کی محصل الافکار، محقق کا رد اور محاکمات تھیں۔ حکمت شرقیہ بھی انہی کے پاس دیکھی، شیخ الرئیس نے اس پر بہت بسیط و عالمانہ شرح لکھی ہے، حکمت شرقیہ کے بارے میں مولانا کہتے ہیں "عام طور پر اس کا نسخہ ہندوستان بلکہ بلاد اسلامیہ میں نایاب تھا، لیکن میں نے شیخ الرئیس کے پاس مع اس کی شرح کے دیکھا اور اس کی مشکلات ان سے حل کیں"۔

امام غزالی کی مقاصد الفلاسفہ جس کی تلاش میں جرمن مستشرق سرگرداں تھے وہ بھی پہلے پہل مولانا نے انہی کے پاس دیکھی تھی، امام شہرستانی کی نایاب کتاب نہایۃ المعقول ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغۃ بھی انہی کے پاس دیکھیں اس کے علاوہ امام رازی کی مسئلہ عدد پر ایک کتاب جس کا نام مولانا کو یاد نہیں رہا بھی ان کے پاس دیکھی۔

مولانا آزاد اور عربی جرائد مولانا کا تعلق عربی جرائد سے بھی مستقل رہا، سب سے پہلا عربی جریدہ جو مولانا نے دیکھا وہ مصر کا المؤید تھا جو مولانا کے والد منگایا کرتے تھے۔

مولانا نے مطالعہ شروع تو اردو کتب سے کیا تھا لیکن بعد میں اسی ذوق و شوق سے عربی کتب کا مطالعہ کرنے لگے، ایک بڑا ذخیرہ تو خود ان کے گھر میں موجود تھا اور نئی کتابوں کے منگوانے میں ان کے والد کو بھی کسی قسم کا تردد نہ ہوتا تھا، لہٰذا مولانا نے کتب فروشوں سے مصر کی نئی نئی کتابیں منگوانا شروع کر دیں، اسی زمانے میں مولانا احمد حسن فتح پوری نے احسن الاخبار نکالا، اس کے تبادلے میں مصر و شام اور طرابلس کے جرائد کے علاوہ المنار اور الہلال آنے لگے، جن سے مولانا نے براہ راست استفادہ شروع کر دیا، اب علوم جدیدہ پر نئی نئی کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق شروع ہوا، جس پر مولانا بیس[۲۰] پچیس[۲۵] روپے ماہانہ خرچ کیا کرتے تھے علوم جدیدہ پر عربی کتابوں کا مطالعہ اسی زمانے کا ہے۔ مشاہیر الشرق نامی جرجی زیدان کی کتاب بھی ریویو کے لئے آئی، اس کے بعد مولانا کو اپنے والد کے ذخیرے میں المؤید کے علاوہ احمد فارس الشدیاق کے جریدے الجوائب اور طرابلس (لبنان) کے نسخے ملے جن سے بہت سی مفید معلومات فراہم ہوئیں۔ اسی زمانے میں وہ اکتفاء القنوع سے بہرہ ور ہوئے، جن جن کتابوں کے بارے میں معلوم ہوتا رہا وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر حاصل کرتے رہے۔

ہندوستان میں عربی لکھنے والوں پر بھی نظر رکھتے تھے، مدراس میں مرزا محمد جان کے بارے میں فرماتے ہیں: "مدراس میں انگریزوں کے میر منشی اور معلم تھے جو علمائے ہند کی واقفیت کے لئے چند انگریزی کتابوں سے ترجمہ کر کے عربی میں لکھتے تھے، عربی عبارت اتنی پختہ اور صحیح مصطلحات پر مبنی ہے کہ اس زمانے میں اس طرح کے قدیم و جدید ذوق کا اجتماع حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے"۔

جب مشہور اور وسیع الاطلاع عالم مولانا کبیر الدین کا کتب خانہ اور پریس فروخت ہوا تو بہت سی نایاب اور قدیم کتابیں مولانا کے ہاتھ بھی لگیں، جن میں بہت سی کتابیں نئے علوم کی

تھیں جن کی عام لوگوں کو اطلاع بھی نہیں تھی، ان میں سے ایک مولانا بتاتے ہیں: "عجیب رسالہ مولوی اعلیٰ تھانوی کا بھی ملا ... نئے علوم کا حال سُن کر ان میں تجسس پیدا ہوا اور جس قدر مبادی واصول تحقیق کرسکے وہ اس رسالے میں جمع کئے، رسالے کی عبارت بہت صاف اور رواں ہے اور کشاف کی طرح الجھی ہوئی نہیں ہے۔"

مولانا نے اپنے کتابی شوق کے سلسلے میں اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ دیا تھا چنانچہ اس بارے میں وہ اپنے خاندانی اثر ورسوخ کے استعمال سے بھی نہیں چوکے اور یہ بات گوارا کرلی کہ ان کے والد کے بعض مریدانہیں کتابیں خرید کردیں اور وہ اشارے کے منتظر تھے چنانچہ بعض نے تو کتب خانے خرید دئے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"کلکتے میں ایک پرانے اہل حدیث مولوی تھے، کتب فروشی بھی کرتے تھے مگر خود بھی کتابوں کے شائق تھے، نواب صدیق حسن خاں کی تمام کتابیں ان کے پاس تھیں، نیز بہت سی کتابیں قلمی اور مطبوعہ نایاب تھیں، وہ جنار کے رہنے والے تھے، انہوں نے اپنی کتب فروخت کرنا چاہیں، شرط یہ تھی کہ پورا کتب خانہ فروخت کریں گے، اصلی قیمت کتابوں کی اگر شمار کی جاتی تو ہزار پندرہ سو سے کم نہ تھی، وہ پانچ سو روپیہ طلب کرتے تھے۔ منشی رضانے جو والد مرحوم کے مریدوں میں ہیں خود جاکے تمام کتابیں خرید کیں اور میرے حوالے کیں۔"

مضامین اجرت پر لکھنے میں بھی یہی شوق کارفرما تھا، اس اجرت سے بھی کتابیں ہی خریدتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں جب وہ بمبئی آئے تو یہاں زیادہ مواقع میسر آئے اور انتخاب کتب کا اچھا موقع ملا، اسی زمانے میں وہ عبداللہ جیتکر سے متعارف ہوئے جو خود بھی صاحب استعداد تھے اور عربی میں شعرگوئی کا شوق بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے شیخ امین خانجی تاجر کتب قسطنطنیہ

ومصر سے شرکت کر رکھی تھی، اس لئے ان کے پاس تمام علوم کا ذخیرہ موجود تھا، بالخصوص نئی تصانیف کا۔ مولانا کے لئے یہ موقع بہت ہی زریں ثابت ہوا، گھنٹوں اس دکان میں گزارتے اور مختلف علوم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور حیثیت کے مطابق خریدتے بھی، مزید یہ کہ سینکڑوں روپے کی کتابیں جیتکر صاحب حسب خواہش منگوادیتے اور مولانا جب چاہتے قیمت ادا کردیتے، اس لئے مولانا ان کے حقوق اور احسان کے معترف رہے۔

عربی کتابوں کے ترجمے سے اشتغال

مولانا نے سب سے پہلا علمی کام جلال الدین السیوطی کے رسالے نور اللمعۃ فی فضائل الجمعۃ کا اردو ترجمہ کیا، اس کے بعد السیوطی ہی کے دوسرے رسالے انیس اللبیب فی خصائص الحبیب کا ترجمہ خصائص محمدیہ کے نام سے کیا۔

بچپن میں مولانا کا اپنی والدہ کی زبان عربی سے زیادہ گہرا تعلق تھا اس لئے شروع میں اردو کے سلسلے میں جو پریشانی پیش آئی اس کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں: "اس زمانے میں اردو زبان بھی میری منجھی نہ تھی اور مادری اثر غالب تھا، کلکتے میں بجز والد کے اور کسی اہل زبان کی صحبت میسر نہ تھی، تاہم شاعری کے شوق نے اس کمی کو بہت جلد دور کردیا مگر کتابت و انشا کے لئے بجز مطالعے کے اور کوئی شے راہنما نہ تھا، بہرحال اپنے طور پر مضامین لکھنے لگا۔"

اسی طرح امام غزالی کی احیاء العلوم سے تعصب کی مضرتیں اخذ کرکے اردو میں مضمون لکھا۔ امام غزالی کی کتاب المضنون بہ علی غیر اھلہ کا شوق اس پر سرسید کے تبصرے سے ہوا، ساتھ ہی ان کی الجام العوام عن علم الکلام پڑھی، المضنون کا ترجمہ کیا، ساتھ ہی تہافت الفلاسفہ کا ترجمہ شروع کیا۔

مولانا نے جو اخبار نکالے ان کے ناموں پر بھی عربی کا اثر واضح ہے اول تو ان کے

نام کسی نہ کسی عربی اخبار کے نام سے ماخوذ ہیں، مثلاً مولانا نے اپنے پہلے اخبار کا نام مصر کے مصباح الشرق کے نام پر المصباح رکھا اسی طرح الہلال اور البلاغ بھی اسی نام کے مصری جرائد سے ماخوذ ہیں۔ غالباً مولانا کے پیش نظر ان کا علمی معیار بھی تھا۔ اس کے لئے ان کے اخباروں اور مصری جرائد کے غائر مطالعے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ ان اخباروں میں عربی سے ماخوذ مضامین کا اچھا خاصا حصہ ہوتا تھا۔ مولانا کو عربی اخبارات و جرائد کے حصول میں سب سے زیادہ فائدہ مولانا احمد حسین فتح پوری کے جریدے احسن الاخبار سے ہوا جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اس کے تبادلے میں مصر، قسطنطنیہ، طرابلس (لبنان) تونس، الجزائر اور امریکا کے تمام جرائد و اخبار و رسائل آنے لگے، ان کے براہِ راست مستفید مولانا ہی تھے اس لئے انہیں سب سے پہلے عالم عرب و اسلام کے حالات سے اچھی طرح واقف ہونے کا موقع اسی ذریعہ سے ملا اور اس سلسلے میں مولانا کی دلچسپی بڑھتی ہی گئی، چنانچہ کہتے ہیں: "یہ دلچسپی بڑھتی ہی گئی اور اس قدر کثرت کے ساتھ وہاں کے حالات و مباحث کا مطالعہ کرتا رہا کہ شاید ہندوستان میں اور کسی کو اتفاق ہوا ہو، اسی [یعنی احسن الاخبار] دفتر میں میں نے سب سے پہلے مصری علمی رسائل میں سے الہلال، والمقتطف دیکھا، نیز المنار مطالعے میں آیا، اسی زمانے میں مرحوم عبدالرحمٰن الکواکبی کی سجل جمعیۃ ام القریٰ، المنار میں چھپ رہی تھی اور نیز مرحوم شیخ محمد عبدہ کا رد، فرح انطون (ایڈیٹر الجامعہ) جو بعد کو الاسلام والنصرانیۃ کے نام سے بصورت کتاب شائع ہوا۔ المنار کیا باعتبار ادب و بلاغت کے، کیا باعتبار مباحث کے میرے لئے بالکل نئی چیز تھی... عربی کتابت [یعنی انشا] و بلاغت کے ایسے صحیح و صادق نمونے کا اس وقت طبیعت پر جو اثر پڑا وہ آگے چل کر عربی علم و ادب کے ذوق میں نہایت کار آمد اور مفید ہوا۔ بلاشبہ اس بارے میں المنار کے مجھ پر حقوق ہیں"۔

مولانا کو احسن الاخبار سے بہت فوائد حاصل ہوئے، ایک تو ہر طرح کی مضمون نویسی کا موقع ملا، نیز مولانا ہی اس اخبار میں عربی اخبارات کے مضامین، خبروں وغیرہ کے انتخاب و ترجمے وغیرہ کا کام انجام دیتے تھے نیز کتابوں و رسالوں پر تبصرے لکھنے اور مضامین وغیرہ کی ترتیب کا کام بھی مولانا ہی کے ذمے تھا، خلاصہ یہ کہ مولانا نے اخباری زندگی میں آنے کا تجربہ اسی اخبار سے حاصل کیا۔

مولانا نے میسیو کینول کی سولر سسٹم پر کتاب کے عبدالرحیم تبریزی کے فارسی ترجمے ہیئت جدیدہ کا اردو ترجمہ کیا، اس ترجمے کے دوران مولانا نے ڈاکٹر ونڈک (Comelius Van Dyck 1816-1895) کی عربی کتاب اصول الہیئۃ پیش نظر رکھی، نیز حدائق النجوم سے مزید اضافے کئے، لیکن کتاب کی طباعت میں فنی رکاوٹوں کے پیش نظر مولانا نے نصف کے قریب ترجمہ کر کے چھوڑ دیا۔

احسن الاخبار بند ہوجانے پر مولانا نے ایک دارالمطالعہ "دارالاخبار" کے نام سے قائم کیا اور ایک انجمن "الاصلاح" کے نام سے بنائی تاکہ اخبارات کے تبادلے کا سلسلہ جاری رہ سکے، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور اخبارات (جو اکثر عربی تھے) بند ہونے لگے تو اسی غرض سے لسان الصدق جاری کیا، اس وقت مولانا کی عمر پندرہ[15] سولہ[14] سال تھی۔ اس کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ مولانا کو عراق جانا پڑا اور لسان الصدق کا سلسلہ بند ہوگیا۔ عراق میں عراقی علماء کے ساتھ صحبتیں رہیں، عراق سے واپسی پر مولانا کی ملاقات علامہ شبلی سے ہوئی اور علامہ ان کے وسیع اور متنوع مطالعے سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں "الندوہ" سنبھالنے کی دعوت دی۔

مولانا کو عربی دانی میں شروع ہی سے دخل تھا، چنانچہ جب قرأت فاتحہ خلف الامام

کے بارے میں حدیث "اقرأ بها في نفسك" [یعنی سورۂ فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو] بیضاوی کے درس کے دوران آئی تو اس پر ان کی والد سے بحث شروع ہوگئی، اگرچہ والد کے رعب کی وجہ سے جم نہیں سکے، مولانا کا اعتراض تھا کہ عربی میں ایسے موقعوں پر نفس کا اطلاق ذات خاص پر ہی ہوتا ہے، جیسے خود آپ اور فارسی میں خود، چنانچہ نفسہ اور انفسکم کا مطلب فلسفے کا اصطلاحی نفس نہ ہوگا بلکہ یہی ہوگا اس کی ذات تمہاری ذوات، مثلاً کہیں گے جاء بنفسہ تو یہ مطلب نہ ہوگا جو اس حدیث میں بتلایا جاتا ہے، پس اقرأ في نفسك تو معترضین کے لئے دلیل ہے نہ کہ قرارت فاتحہ خلف الامام کا انکار کرنے والوں کے لئے۔ اقرأ في نفسك کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے اندر پڑھ، تو مقصود یہ تھا کہ پکار کر نہیں پڑھنا چاہئے، اس طرح آہستہ آہستہ پڑھنا چاہئے جیسے آدمی اپنے سے باتیں کرتا ہے، مولانا کی نظر میں یہ نت نیا اعتراض تھا جو انہیں بعد میں فریق ثانی کی کسی کتاب میں نہیں ملا۔ بقول مولانا کے۔ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں قطعاً وہ معنی نہیں ہو سکتے جو ابن ہمام وغیرہ نے کئے ہیں ... اور اعتراض یہ ہوگا کہ قرارت صوتی اور قرارت نفسی کی جو تقسیم کی جاتی ہے وہ اس وقت کہاں تھی!

مولانا کی عربی کتابوں پر بڑی گہری نظر تھی بلکہ ان کے علوم و دانش کا سرچشمہ وہی تھیں۔ شرح سفر السعادۃ کے بارے میں بیان کرتے ہیں: "فیروز آبادی علامہ ابن قیم کے شاگرد تھے، اس سے ان کے مسلک کا حال معلوم ہو سکتا ہے" سفر السعادۃ یا صراط مستقیم انہوں نے زاد المعاد سے اخذ کر کے لکھی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے باب میں بہترین مختصر متن ہے شیخ نے اس کی شرح صرف اس لئے لکھی کہ حنفیت کا انتصار اور اس کے ابواب و تراجم کا رد کیا جا سکے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مولانا نے جس قدر عربی کتابوں کا مطالعہ کیا اتنی تعداد میں کسی اور زبان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے عربی دانوں اور پیشہ ور عربی داں حضرات میں بھی خال خال ہی ہوتے ہیں۔ مولانا کے زیادہ تر موضوعات بھی ایسے تھے جن کے ماخذ و مراجع عربی ہی میں ہوتے اسی لئے ان کا اور عربی کتابوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا، یہی وجہ ہے کہ ہم مولانا کے یہاں عربی عبارتوں، تراکیب، اشعار اور عربی خیالات کا جو جم غفیر دیکھتے ہیں وہ ان کے کسی معاصر، پہلے یا بعد کے عالم کے یہاں نہیں ملتا، بلکہ اردو کی نثر نگاری کا یہ اسلوب مولانا ہی سے شروع ہوتا ہے اور مولانا ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ مولانا کے یہاں البلاغ اور الہلال میں عربی کی عبارتیں اور ترکیبیں بہت ملتی ہیں، بلکہ عناوین زیادہ تر عربی یا عربی سے ماخوذ ہوتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ مولانا نے کبھی عربی میں باقاعدہ مضمون نگاری نہیں کی، لیکن ان کی قدرت پر شک نہیں کیا جا سکتا، جو عربی مضامین البلاغ اور ان کے عربی رسالے الجامعہ میں ملتے ہیں ان کی عربی بہت معیاری ہے، البتہ خاص طور پر الجامعہ میں شایع ہونے والے مضامین تحقیق طلب ہیں کہ ان میں کون سے مضامین مولانا کے اپنے قلم سے ہیں اور کون سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا ترجمہ کئے ہوئے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے عربی میں لکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی چونکہ یہ زبان ان کے دائرۂ کار سے خارج تھی، الجامعہ کا اجرا بھی وقتی تقاضوں کے پیش نظر عمل میں آیا تھا، جب برطانیہ کی شہ پر شریف مکہ[1] نے عثمانی خلافت کے

---

[1] یہاں یہ عرض کرنے میں مضائقہ نہیں کہ اس بغاوت کے سرگرم کارکن شریف مکہ حسین نہیں بلکہ ان کے بڑے بیٹے عبداللہ تھے، جو انگریزوں کے سیاسی چنگل میں پھنس گئے تھے اور باپ کو بھی اپنی رائے پر آمادہ کر لیتے تھے، کارنامے بیٹے کے زیادہ ہوتے تھے، باپ کا نام ان کے سیاسی رتبے کے پیش نظر چلتا تھا۔

خلاف علم بغاوت بلند کیا تو مولانا کو اپنا پیغام عربوں تک پہنچانے کی ضرورت پیش آئی اور اس کے لئے ان کی مردم شناس نظر مولانا ملیح آبادی پر گئی جو اس کام کے لئے سب سے موزوں شخص تھے، پالیسی کی نگرانی مولانا آزاد خود کرتے تھے، اسی لئے جب ان کی عدم موجودگی میں علامہ رشید رضا کا مضمون چھپا جو رسالے کی پالیسی کے خلاف تھا تو مولانا ملیح آبادی کی گرفت کی۔ مولانا آزاد کی ایک عربی عبارت ہم یہاں ذکر کرنا چاہیں گے جس میں انہوں نے مسلمانوں کی خستہ و زبوں حالی پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے، اس کی فصاحت و بلاغت کا عربی داں حضرات کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا:

ورود مقدس یوم الحج | بل نکتب والیراع	ہم یہ لکھ رہے ہیں اور قلم خون کے آنسو
يقطر دما، والقلب يكاد يتمزق	بہا رہا ہے، اسلام اور مسلمانوں کو جس
اسی واسفا مما اصاب الاسلام	زبردست ذلت وحقارت، خواری
والمسلمین من الذل المهین	و بے عزتی اور رسوائی، زبردست دباؤ
والعار المشین والازدراء الهائل	اور ہولناک قتل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے
والاحتقار الفاضح والضغط	اس کے لئے دل غم و افسوس سے پھٹا جارہا
الفظیع والقتل المریع فحاشا	ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ ہوشیار اور خبردار
للمسلمين ان يكونوا من القوم	رہیں اور کافر و ناشکری قوم نہ بن جائیں۔
الكافرين [1]	

مولانا کی قادر الکلامی اور عربی فہمی کے بارے میں وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جس کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا ہے، ندوہ کے ایک اجلاس میں علامہ رشید رضا کی آمد پر

[1] مضامین ابوالکلام حصہ پنجم صفحہ ۳۳۔

عربی و اردو میں ماہر شخص کی ضرورت تھی جو ان کی تقریر کا اردو ترجمہ کر سکے، اس کام کے لئے مولانا آگے آئے، سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں رقمطراز ہیں "اس اجلاس (ندوہ) میں مولانا ابوالکلام آزاد کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے، وہ سید رشید رضا کی عربی تحریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوئے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم پیدا کر دیا"۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی زیر مطالعہ کتابوں پر حواشی بھی لکھتے تھے جو عموماً اردو و فارسی میں ہوتے تھے، ان حواشی کو سید مسیح الحسن نے بڑی محنت سے جمع کر کے اردو اکادمی دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شایع کیا ہے، ان میں عربی کتابوں پر بھی حاشیے ہیں جن میں کہیں کہیں عربی بھی استعمال کی ہے [1] لیکن یہ عربی عبارتیں آیات و احادیث اور اشعار پر مبنی ہیں جن کی نقل میں مرتب صاحب کی غلطیاں بھی بظاہر شامل ہیں [2]۔

یہاں پر ہم ان عربی کتابوں کا ذکر بھی مناسب سمجھتے ہیں جن پر مولانا نے الہلال یا البلاغ میں تبصرہ کیا یا ان کا ترجمہ وغیرہ پیش کیا۔

ترجمہ [اردو] تفسیر کبیر (رازی) از مولوی محمد اشفاق دہلوی (الہلال ۱۹/۳/۱۹۱۳)

غبطة الناظر، عربی میں (ابن حجر کی طرف منسوب) شیخ عبدالقادر جیلانی کی مختصر سوانح، ڈاکٹر ڈراس، سابق پرنسپل مدرسہ کالج، کلکتہ کی ایڈٹ کی ہوئی (الہلال ۵/۱۱/۱۹۱۳)

[1] مولانا کے مطالعہ میں آئی ہوئی اس طرح کی ایک کتاب دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی ہے جو عبدالقاہر جرجانی کی الفرق بین الفرق ہے۔ اس میں کہیں کہیں ان کے حاشیے ہیں۔ "ص" [2] یہ عبارتیں ان کی عربی انشاء کے لئے کوئی قابل قدر ثبوت نہیں، بلکہ ہمیں وہ عام غلطیاں بھی جو ہندوستانی یا غیر عرب عربی دانوں سے ہوتی ہیں۔ ان عبارتوں کی قلت کے باوجود ان میں ملتی ہیں مثلاً الیوم التاسع کی جگہ یوم التاسع (لعلہ) بلا یوپنڈٹ کی جگہ (لعلما)... وغیرہ۔

معراج العقول [عربی] از مولانا سید مرتضیٰ نونہروی (البلاغ شمارہ ۱۲)

یورپ میں عرب نسل پر ڈاکٹر احمد شاہین مصری کی کتاب (جس کا نام نہیں لکھا) سے فرانس میں عرب نسل سے متعلق معلومات کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ (الہلال ۲۴/۶/۱۹۲۷)

ڈاکٹر احمد بک کمال کی آثار مصر پر کتاب جس کے کچھ حصے کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ (الہلال ۲۲/۷/۱۹۲۷)

الحریۃ الشخصیۃ یا ذاتی آزادی کے موضوع پر مصر کے کسی عربی مقالات کے مجموعے پر تبصرہ اور اس سے کچھ ترجمہ (الہلال ۱۶/۹/۱۹۲۷)

از منۂ وسطیٰ کے شاہی مراسم، سفیروں کے استقبال کے موضوع پر جرمن میں کسی کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ مصر کے المقتطف میں شایع ہوا تھا، یہ اس کا ترجمہ ہے (الہلال ۲۸/۱۰/۱۹۲۷)

مولانا آزاد عرب ممالک میں معروف تھے، ان کے انتقال کی خبر عرب ممالک کے بعض اخبارات وجرائد میں بھی شایع ہوئی، مصر کا مشہور روزنامہ الاہرام بھی ان میں سے ہے۔

ان پر مشہور عرب لکھنے والوں میں انور الجندی (تراجم الاعلام المعاصرین) الزرکلی (الاعلام) رضا کحالہ (معجم المولفین) عبدالمنعم النمر (ابو الکلام آزاد) ہیں، ان کی وفات پر الشیخ محمد المامون الدمشقی کا نثری مرثیہ عربی میں بھی ملتا ہے (الجمعیۃ آزاد نمبر) اسی طرح الجمعیۃ - آزاد نمبر میں سید امین الحسینی المدنی کے تاثرات کا (عربی سے) اردو ترجمہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے اہم کام آزادی کے بعد انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کا قیام اور اس سے عربی رسالے "ثقافۃ الہند" کا اجرا ہے، جس کا پہلا شمارہ ۱۹۵۰ء میں

منظر عام پر آیا، یہ رسالہ مسلسل عربی زبان وادب کی خدمت کر رہا ہے[1] نیز اس کونسل کا دائرۂ کار بھی عرب ممالک تک وسیع ہے، خاص طور پر مصر و سیریا میں یہ وسیع پیمانے پر سرگرم ہے۔ کافی ہندوستانی کتابوں اور مضامین کے ترجمے بھی اس کونسل نے عربی میں کرائے ہیں۔ مولانا نے اپنی لائبریری بھی اس کونسل کو بخش دی تھی، اس کی لائبریری عربی کی ایک اچھی لائبریری ہونے کے ساتھ ساتھ آزادیات کا سب سے بڑا مرکز شمار ہوتی ہے۔

۱؎ جب تک جناب نثار احمد فاروقی اس رسالے کے مدیر تھے برابر معارف کے تبادلے میں اور دارالمصنفین سے حضرت مولانا آزاد کے گوناگوں تعلقات کی بنا پر یہاں آتا تھا مگر فاروقی صاحب کے ادارت سے ہٹنے کے بعد نہ جانے کیوں بند کر دیا گیا، حد یہ ہے کہ اس سلسلے میں رسالے کے موجودہ ذمہ دار کوئی جواب بھی دینا پسند نہیں کرتے یا للعجب" ض"

ماخذ ومراجع (الف) اردو

(۱) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بروایت (مولانا عبدالرزاق) ملیح آبادی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۵۸ء (۲) امام الہند (تعبیر افکار) ابوسلمان الہندی، مکتبہ اسلوب، کراچی (ب-ت) (۳) مضامین ابوالکلام (نایاب مضامین کا مجموعہ) مرتبہ منشی مشتاق احمد، ناظم قومی دارالاشاعت، محلہ کوٹلہ، شہر میرٹھ، حصہ پنجم (۴) الہلال کے تبصرے، مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۸ء (۵) الجمعیۃ (آزاد نمبر) ۳ دسمبر ۱۹۵۸ء

عربی (ب)

(۱) تراجم الاعلام المعاصرین فی العالم الاسلامی، از انور الجندی، مکتبۃ الانجلو المصریہ (پہلا ایڈیشن) ۱۹۷۰ء (۲) الاعلام، از خیر الدین الزرکلی، دارالعلم للملایین - بیروت (ط ۵) ۱۹۸۰ء ج ۱ (۳) معجم المولفین، از عمر رضا کحالہ، مکتبۃ المثنیٰ بیروت (ب-ت) ۸/۱۴۵ (و ۱۳/ ۳۵۷)

حضرت شاہ حمایت علی قلندرؒ

از جناب ڈاکٹر عمر کمال الدین صاحب*

حضرت شاہ حمایت علی کی پیدائش ۱۱۸۵ھ/۱۷۶۹ء میں ہوئی[1] یہ مولانا شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ سے تقریباً چار برس چھوٹے تھے۔ عہدِ طفولیت سے آپ کے بارے میں مشہور تھا کہ جس چیز کے بابت کچھ کہتے وہی ہوتا "نورلاریب" کی روایت ہے:

"در زمان پنج و شش سالگی کیفیتش چنیں بود کہ اگر در حق کسے چیزے می گفت مطابق آں ظہور می کرد چنانچہ یک بار در ہماں امساک باراں شدہ بود مردم قصبہ برائی نماز استسقا در باغی متصل تکیہ شریف جمع شدند اتفاقاً ایشاں ہم مثل طفلاں بازی کناں آنجا رسیدہ پرسیدند کہ ایں جماعت کیست؟ و سر برہنہ چرا اند؟ کسے بگفت کہ بہ طلب باراں زاری می کنند گفتند عبث است بخانہ خود روند و چاہ کنند یعنی نزول بارانِ رحمت نخواہد شد پس ہم چناں شد کہ از زبانِ

---

[1] تذکرہ مشاہیر کاکوری" ص ۱۳۵ پر سنہ ولادت ۱۱۸۹ھ تحریر ہے جو غالباً سہو کتابت ہے، کیونکہ "اصول المقصود" مولفہ شاہ تراب علی قلندر میں شاہ صاحب نے ص ۲۷۲ پر لکھا ہے "ایشاں قریب چہار سال از فقیر خورد بود" چونکہ شاہ صاحب کی سنہ ولادت ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۵ء ہے اس لئے مولانا شاہ حمایت علی قلندر کے تولد کا سال ۱۱۸۵ھ/۱۷۶۹ء ٹھہرتا ہے جس کی تصدیق "اذکار الابرار" ص ۲۶۱، "نورلاریب" ص ۲-۳، "تذکرہ گلشن کرم" ص ۵۲ و "نزہتہ الخواطر" ج ۷، ص ۱۳۶ سے ہوتی ہے۔

---

* ۱۲۰-چودھری محلہ جنوبی کاکوری۔ لکھنؤ۔

ایشاں برآمدہ بود"[1]

چشمۂ فیض کے مطابق "مولوی حمایت علی فاضل زبردست ولی مادرزاد بود در بچگی ہر چہ می گفت، بظہور می پیوست"[2]

تعلیم و تربیت دس سال کی عمر میں وہ حالتِ جذب و کیفیت فرو ہوگئی اور تعلیم و تربیت کی طرف رغبت و توجہ ہوئی، اولاً شاہ محمد کاظم قلندرؒ سے فقہی مسائل، اذکار و اشغالِ خاندانی اور تصوف کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد علومِ عربیہ کی تحصیل شاہ تراب علی قلندرؒ سے کی بقول شاہ تراب علی قلندرؒ "کتاب میزانِ منشعب از فقیر شروع کردہ بود"[3] "فصول اکبری" حکیم محمد حیات ساکن بدہہ لکھنؤ سے پڑھی، پھر سندیلہ جاکر مولوی قاسم علی و مولوی حیدر علی اخلاف ملا حمداللہ شارح سلم سے تعلیم حاصل کی، کچھ دنوں لکھنؤ میں مہاراجہ ٹکیت رائے کے مدرسہ میں مولوی عبدالواجد خیرآبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آخر میں قصبہ دیوہ جاکر مولانا ذوالفقار علی نقش بندی سے ہدایہ وغیرہ پڑھ کر دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ نزہتہ الخواطر کے مطابق

"... وقرأ المختصرات على الحكيم محمد حيات الكهنوى ثم سار الى "سنديله" واخذ عن الشيخ قاسم على بن حمد الله السنديلوى ثم دخل لكهنؤ واخذ عن المفتى عبد الواجد خيرآبادى ثم رحل الى "ديوه" ولازمه الشيخ ذو الفقار على الديوى وتخرج عليه"[4]

نورلاریب کی روایت ہے کہ:

"از عمر دہ سالگی بہ تحصیلِ علم پرداختند و کتب مسائل فقہیہ و علوم ضروریہ خاندان خود یعنی کتب تصوف و اذکار و اشغال و اعمال قلندریہ از خدمت حضرت والد ماجد خویش

---

[1] نورلاریب ص ۳ [2] چشمۂ فیض قلمی ورق نمبر ۱۱۶ الف [3] اصول المقصود ص ۲۷۳ [4] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۱۳۶

تحصیل فرمودہ رجوع بہ علوم عربیہ نمودند و مختصرات عربیہ بخدمت برادر بزرگ مرشد مرشدنا حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرۂ شروع کردند دراں زمانہ از حکیم محمد حیات ساکن بدہہ و بعدازاں در سندیلہ رفتند از مولوی قاسم علی خلف مولانا حمداللہ سندیلی و از مولانا عبدالواجد خیرآبادی کہ مدرس مدرسہ مہاراجہ ٹکیت رائے بودند در لکھنؤ رفتہ خواندو قریب فراغ رسیدند مگر بوجہ عوائق و موانع چند درچند از آنجا ترک نمودہ در "دیوہ" رفتہ و بخدمت حضرت مولانا ذوالفقار علی از علمائی کامل و عرفائی واصل و صاحب نسبت و از خلفائی حضرت عمدۃ الکاملین سید محمد عدل المعروف بہ شاہ لعل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ بودند ہدایہ و کتب دیگر انتہائی خواندہ از دستِ مبارک شاہ دستار فراغت بستند"۔[۲]

نکاح واولاد واحفاد "چشمۂ فیض" کی روایت کے مطابق ان کا نکاح شیخ نجم الہدیٰ کی بیٹی سے ہوا۔ اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی زندہ رہیں۔ بیٹی کا نکاح شاہ نظام علی قلندرؒ سے ہوا۔

چشمۂ فیض کی روایت کے مطابق:

"شیخ نجم الہدیٰ دخت عم راقم کدخدا بود دو پسر و یک دختر دارد مولوی رضا علی و مولوی باسط علی و مسماۃ حفیظ النساء زوجہ شاہ نظام بن شاہ بہرام علی"۔[۳]

نفحات النسیم میں مولوی سمی علی لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ حمایت علی قلندرؒ پسر دوم حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ کا نکاح شیخ نجم الہدیٰ کی بیٹی سے ہوا۔ کئی اولادیں ہوئیں اور ضائع ہوئیں۔ دو بیٹے مولوی رضا علی اور مولوی

---

[۱] اذکار الابرار ص ۲۰۳ کی روایت کے مطابق مولانا عبدالواجد خیرآبادی عدالتِ دیوانی میں ملازم ہوگئے۔ [۲] نورالاب: ص ۲۰۳ تقریباً یہی عبارت مواہب القلندر ص ۹ کی ہے۔ [۳] چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۶ الف۔

باسط علی اور ایک بیٹی جن کا نکاح شاہ نظام علی مذکور سے ہوا"۔[۱]

مولوی رضا علی کی ولادت ۹ رمضان المبارک ۱۲۱۱ھ بروز پنجشنبہ ہوئی۔ کتب درسیہ والد محترم سے پڑھیں، بیعت شاہ تراب علی قلندرؒ سے ہوئے۔ اجازت وخلافت بھی انہیں سے حاصل تھی مگر سلسلۂ مریدی ان سے نہیں جاری ہوا۔ غدر ۱۸۵۷ء سے قبل علاقہ گورکھپور میں تحصیل دار تھے، بہ عارضہ فالج بروز چہارشنبہ ۸ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء وفات پائی اور والد کے مزار کے پائیں مدفون ہوئے۔[۲]

دوسرے صاحب زادے مولوی باسط علی بروز دوشنبہ ۱۵ رمضان المبارک ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت حضرت شاہ تقی علی قلندر سے پائی۔ بیعت، اجازت و خلافت شاہ تراب علی قلندرؒ سے تھی۔ علاقہ کالپی و دیگر اضلاع میں تحصیل دار رہے۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء بروز دوشنبہ بہ صدمۂ وفات برادرِ بزرگ وفات پائی اور علاقہ بدوسہ ضلع باندہ میں متصل قبر پیارے شہید دفن ہوئے۔[۳]

بیعت، اجازت وخلافت حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ نے صغر سنی میں ہی آپ کو اپنا مرید کرلیا تھا اور اجازت وخلافت سے سرفراز کیا تھا۔

"نیز دراں زماں بہ سعادت بیعت در سلسلۂ قادریہ رضویہ بردست حق پرست والد ماجد خویش فائز گردیدند و منشور اجازت و خلافت در اخذ بیعت، وارشاد و امور فقر در سلاسل عالیہ عثمانیہ یعنی قلندریہ و قادریہ چشتیہ و سہروردیہ و فردوسیہ و طیفوریہ و مداریہ و نقشبندیہ .... بکف آوردند"۔[۴]

---

[۱] نفحات النسیم فی تحقیق اولاد ملا عبدالکریم از مولوی سمی علی بہ تکملہ منشی امیر احمد علوی ص ۱۱۰-۱۱۱ [۲] ملخص از مشاہیر کاکوری ص ۱۶۲ و اذکار الابرار ص ۲۰۵-۲۰۴-۲۰۳ [۳] تلخیص از مشاہیر کاکوری ص ۹۳ [۴] نورالاب ص ۲۰۵

فراغ حاصل کرنے کے بعد مولانا ذوالفقار علی نقش بندی خلیفہ سید محمد عدل المعروف بہ شاہ لعل بریلوی سے اجازت و خلافت سلسلۂ نقش بندیہ میں حاصل کی، اس کے علاوہ شاہ ابوسعید رائے بریلوی و حاجی امین الدین محدث کاکوروی سے بھی سلسلۂ نقش بندیہ میں اجازت و خلافت حاصل تھی[1] مولانا ذوالفقار علی نقش بندی کی وصیت کے مطابق سماع باوجود شوق کے نہیں سُنتے تھے۔[2]

والد محترم شاہ محمد کاظم قلندرؒ کو بھی ان کا پاسِ خاطر اتنا تھا کہ اگر کوئی ان کے پاس گاتا ہوتا تو وہ آپ کو دیکھتے ہی یہ کہہ کر کہ "حمایت علی آتے ہیں خاموش ہوجاؤ" موقوف کرادیتے۔[3]

والد محترم کے انتقال کے بعد برادر محترم شاہ تراب علی قلندرؒ نے بھی اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔[4]

درس و تدریس علوم عقلیہ و نقلیہ سے فراغ حاصل کرنے کے بعد جب وہ دیوہ سے وطن واپس تشریف لائے تو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوئے۔[5]

اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ خانقاہ میں درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز شاہ حمایت علی قلندرؒ نے کیا اور یہ سلسلہ مشیخت کے بعد بھی جاری رہا اور تشنگان علوم ظاہری و باطنی کی سیرابی میں پوری عمر گزار دی۔[6]

شاگردوں کی تعداد بہت ہے مگر تحقیق کے باوجود صرف چند حضرات کے نام معلوم ہوسکے (۱) مولوی حسین بخش (۲) مولوی قادر بخش (۳) مولوی حکیم باسط (۴) شاہ حیدر علی قلندرؒ

[1] اذکار الابرار ص ۳۶۴-۳۶۳، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۶۳ [2] اصول المقصود ص ۴۷۳ [3] ایضاً ص ۴۷۵
[4] اذکار الابرار ص ۳۶۵ [5] اصول المقصود ص ۴۷۲ [6] ایضاً ص ۴۷۷

(۵) شاہ تقی علی قلندرؒ (۶) مولوی رضا علی قلندرؒ (۷) شاہ نظام علی قلندرؒ (۸) شاہ کرامت علی قلندرؒ (۹) ملا محمد مراد۔[1]

ارشاد و تلقین گو ان کو خرقہ ان کے بڑے بھائی شاہ تراب علیؒ نے پہنایا تاہم شاہ محمد کاظم قلندرؒ نے بھی اجازت و خلافت سے نوازا تھا اور یہ ان کے بعد صرف ۵ سال حیات رہے۔ لیکن اس مختصر مدت میں بھی بکثرت لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا[2] جس کی شہادت "اصول المقصود" کی ایک روایت سے بھی ملتی ہے۔[3]

منشی فیض بخش لکھتے ہیں "بعد حصول علم ظاہر مشغول بہ اشغال شد چنداں کہ از پدر تجاوز کردہ.... عالمے را از دیدن او شاہ محمد کاظم فراموش بودند"۔[4]

صاحب اذکار الابرار رقم طراز ہیں "حضرت عارف باللہ کے بعد وہ کم و بیش پانچ[5] سال زندہ رہے مگر اس کم مدت میں ان کے اوصاف، محامد اور علم و فضل و فقر و کمال کا شہرہ ہوگیا۔ اور سلسلۂ بیعت و ارشاد طریقۂ کاظمیہ ان کی ذات گرامی سے خوب جاری ہوا"۔[6]

"تذکرہ مشاہیر کاکوری" کے مطابق "سلسلۂ قلندریہ کی اشاعت تھوڑی مدت میں ان کی ذات سے بہت ہوئی اور ایسی قبولیت عوام و خواص میں پیدا کی کہ باید و شاید"۔[7]

حضرت مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ نے راقم السطور سے خود بیان فرمایا کہ "شاہ حمایت علی قلندرؒ کی حیات میں ان کے مریدین کی تعداد برادر اکبر شاہ تراب علی قلندرؒ کے مریدین سے بہت زیادہ تھی"۔

اخلاق و عادات شاہ صاحب کی طبیعت بچپن سے ہی فقر و درویشی کی طرف مائل تھی لہو و لعب

[1] اذکار الابرار ص ۳۶۳ و مشاہیر کاکوری ص ۱۳۶ [2] مواہب القلندر ص ۹ [3] اصول المقصود ص ۴۷۴ [4] چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۶ الف [5] اذکار الابرار ص ۳۶۵ [6] تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۳۶۔

طعام لذیذ اور پوشاکِ نفیس سے بڑی نفرت تھی، نہایت وسیع الاخلاق تھے۔ والدین، استاد اور دیگر بڑوں کی خدمت بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ والدِ محترم کی خدمت میں جو مقبولیت حاصل تھی وہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہوتی ہے:

"خط شمارا مشتاق می باشم و ہیچ یکے ضائع نکردہ ام اگرچہ پارہ کردن نوشتہ بودند گاہ گاہے می بینم بملاحظ ثانی وثالث در آمدہ دل خوش می شود ایں خط بسیار مسرور کرد وفہرست کتابہا انگاہداشتہ ام انشاء اللہ تعالیٰ ہم میسر خواہد آمد بلکہ ام الکتاب را امیدوار باشند کہ ہمہ علوم از آنجا است ما را از جناب عالی محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام و زبان مبارک حضرت سرشدی علم اولین و آخرین بشارت شدہ است ہمہ در شما ظہور خواہد کرد خاطر جمع دارند و خدا را یاد دارند"[1]

"نور لاریب" کے مطابق:

"اوصاف حمیدہ و اخلاق پسندیدہ وی بسیار بودند از آں جملہ ایں ست گاہے رغبت بہ لباس فاخرہ نہ فرمود بلکہ ہمیشہ بوضع درویشانہ ماند و جامہ و دستار و پیرہن کہ از وضع اشراف سادات بود معمول بخود داشت و نہ گاہے رغبت بہ سوئے حطام دنیا و معاشی ظاہری کرد باوجودیکہ چند مرتبہ براں قدرت ہم یافت چنانچہ منقول است کہ یک بار استادِ ایشاں حضرت مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ برائی نیابت خود در عدالت ایشاں را می خواستند مگر منظور نہ فرمود و دیگر در ہماں زمانہ قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں کاکوروی المتخلص بہ ثاقب کہ در شہر کلکتہ بعہدۂ قاضی القضاتی مامور بودند بساصاحب جاہ و فراغت بودند برائے ایشاں تجویز روزگار کردند مگر آں را نیز قبول نہ نمودند"[2]

---

[1] مخادضات ص ۱ [illegible] روز دیم [2] نور [illegible] ص ۱۹۹ [illegible] (۳۰۱) کی تصدیق اصول المقصود ص ۲۷ سے بھی [illegible] ہے

صاحب "اذکار الابرار" لکھتے ہیں: "ان کی ذات ستودہ صفات جامع علم ظاہر و باطن، شریعت و طریقت سے آراستہ اور حقیقت و معرفت سے پیراستہ تھی۔ نہایت وجیہ الصورت، صبیح الوجہ، وسیع الاخلاق تھے"[1]

انتقال ابھی ان کی عمر اکتالیس[41] برس ہی کی تھی کہ ۲۵ رجب المرجب ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء بروز جمعہ سانپ کے کاٹنے سے انتقال فرمایا[2]

چشمۂ فیض کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"...... روز در عین عروج ہمہ چیز یعنی عروجِ جوانی و عروجِ علم ظاہر و باطن کہ عالمے را از دیدن او شاہ کاظم فراموش بودند برائے وضو برخاست وقت جناب ملک الموت بصورت مار پیدا شدہ بر پائے مبارک نیش اجل زد کہ صبح آں بمقام ملاء اعلیٰ صعود فرمود"[3]

مزار حضرت مولانا شاہ محمد کاظم قلندرؒ کے مقبرہ میں جانب مغرب واقع ہے جس پر مولوی شریف الدین شریف کاکوروی کا منظومہ قطعہ تاریخ وفات نصب ہے۔

حضرت مولوی حمایت علی	ابن کاظم شہ خجستہ نہاد
روز آدینہ بست و پنج رجب	آں قلندر منش بزرگ نژاد
دیدہ از چشم دل چو عالم قدس	گشتہ از بند عنصری آزاد ۱۲۲۶ھ

خلفاء شاہ صاحب کے خلفاء کا ذکر تلاشِ بسیار کے باوجود کسی کتاب میں نہیں ملا صرف شاہ بہرام علی قلندرؒ و شاہ نظام علی قلندرؒ کی اجازت و خلافت کا ذکر تذکرہ مشاہیر کاکوری میں ہے۔[4]

---

[1] اذکار الابرار ص ۳۶۵ [2] مواہب القلندر ص ۱۰۹، اذکار الابرار ص ۳۶۵، مشاہیر کاکوری ص ۱۳۶، تذکرہ گلشن کرم ص ۹۳، اصول المقصود ص ۳۷۹ [3] چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۲ الف [4] مشاہیر کاکوری ص ۱۳۶۔

تصنیفات ان کی تصنیفات میں مندرجۂ ذیل کتابیں دستیاب ہیں۔

(۱) رکاز الاصول شرح فصول اکبری (۲) نور لاریب فی ترجمہ فتوح الغیب (۳) ملہم الصواب (۴) معدن علوی۔

(۱) رکاز الاصول : قاضی سید علی اکبر الہ آبادی[1] کی مشہور کتاب "فصول اکبری" جس میں عربی زبان کی صرف کے قواعد بیان کیے ہیں اور جو عربی مدارس کے ابتدائی درجات کے نصاب میں اب تک شامل ہے اس کی نہایت عمدہ لاجواب شرح فارسی زبان میں کی ہے[2] کتاب ۲۵ سطری

---

[1] قاضی سید علی اکبر حسینی حنفی الہ آبادی کو علماء میں امتیازی شان حاصل تھی علامی سعد الدین نے انہیں اپنے فرزند کا اتالیق مقرر کیا تھا اورنگزیب کے زمانہ شاہی میں شاہزادہ محمد اعظم کی تعلیم پر مامور رہے ان کی فقاہت اور بالغ نظری کے پیش نظر عالمگیر نے لاہور کا عہدۂ قضا ان کے سپرد کیا جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یہ فتاویٰ عالمگیری کے مولفین میں تھے اور اس کے ایک چوتھائی حصہ کی نگرانی ان کے ذمہ رہی۔ ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۸ء میں لاہور کے گورنر قوام الدین اصفہانی کے اشارے پر کوتوال شہر نے انہیں قتل کر دیا۔ عالمگیر کو جب علم ہوا تو کوتوال شہر کو قصاص میں قتل کر دیا گیا اور گورنر کو شیخ الاسلام کے حوالے کر دیا گیا جو قاضی صاحب کے لواحقین کے معاف کرنے پر اپنی جان بچا سکا۔ قاضی صاحب موصوف بلند پایہ قواعد داں تھے ان سے حسب ذیل کتابیں یادگار رہیں۔

(۱) فصول اکبری (فارسی) قواعد میں (۲) اصول الاکبریہ (عربی) قواعد میں (۳) گہر منظوم (فارسی) عربی قواعد صرف فارسی نظم میں (۴) رسالہ لامیہ (اس کتاب میں الف لام (حرف تعریف) کے استعمال اور معنی پر بحث کی ہے)

[2] فصول اکبری کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں ایک عمدہ شرح ملا علاء الدین فرنگی محلی (م ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) کی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمن علی لکھنؤ اڈیشن ص ۱۴۱)۔

۲۷۷ صفحات پر محیط ہے اور اپنی نفع رسانی کے سبب مطبع نول کشور و دیگر مطابع سے متعدد بار شایع ہو چکی ہے۔ راقم السطور کے پیش نظر "رکاز الاصول" کا مطبع نول کشور کا جولائی ۱۹۹۸ء کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ سرورق کی عبارت مندرجۂ ذیل ہے:

بعون صناع مکین و مکان و فضل خالق زمین و زمان

شرح حامل المتن فصول اکبری در صرف

شرحیست بس شگرف و بسوط کشاف مطالب رشیقہ حلالی مشکلات مآرب انیقہ

جامع ضوابط عربیہ حاوی قواعد صرفیہ مشتمل ابواب فصول مسمیٰ

"رکاز الاصول"

تصنیف لطیف قدوۂ علمائی زماں اسوۂ فضلائی دوراں عالم علوم عقلی و نقلی

مولوی حمایت علی بن مولوی محمد کاظم خلف محمد کاشف العلوی الکھنوی الکاکوروی

بصحت تمام

در مطبع نامی منشی نول کشور بہ طبع مزین مقبول جہاں شد

ابتدائی سطور میں حمد و صلوٰۃ کے بعد شرح لکھنے کا مقصد بیان کیا ہے۔

صاحب "فصول اکبری" نے عربی قواعد میں "اسم مشتق کی چھ[6] قسمیں اسم فاعل[1]، اسم مفعول[2]، اسم تفضیل[3]، اسم آلہ[4]، اسم ظرف[5] اور اسم صفت[6] مشبہ بیان کی ہیں۔ اس سلسلہ میں "اسم تفضیل" کی تعریف اور اس کے بنانے میں "فصول اکبری" کے متن اور "رکاز الاصول" کی شرح کا ترجمہ پیش ہے:

"تیسرا اسم تفضیل ہے اور (یہ) وہ اسم ہے کہ مصدر سے بنا ہوا ہے، اس چیز کے لئے فعل کی زیادتی کے ساتھ جو اپنے غیر سے متصف ہے" میزانہ افعل" یعنی اس کی میزان

افعل ہے جیسے زید عمر کے مقابلے میں بڑا ہے جو کہ موصوف کی (یعنی زید کی) زیادتی پر دلالت کرتا ہے کہ عمر ہے اس فعل میں وہ علم ہے اور فُعلی پیش کے ساتھ مونث کے لئے جیسے فعلی اور اس کے بنانے کی شرط یہ ہے کہ اس کا ماخذ ثلاثی مجرد تام متصرف ہو اور زیادتی کے لائق ہو اور ظاہری لون وعیب کے معنی (اس میں) نہ ہوں لہذا رباعی اور ثلاثی مزید سے نہیں آتا ہے اسی طرح فعل ناقص سے بھی نہیں جیسے کَانَ کا دا ور اس جیسے فعل غیر متصرف سے بھی نہیں آئے گا، جیسے نِعمَ وبِئسَ اور اس فعل سے جس کے معنی زیادتی اور کمی کو قبول نہ کریں جیسے مَاتَ بناتے ہیں اور اس سے ظاہری لون وعیب نہیں ہوتا ہے لہذا اس میں افعَلُ (صیغہ) صفت (تو) آتا ہے نہ کہ (اسم) تفضیل جیسے اَسوَد اور اُعوَر بہر حال اسم تفضیل عیب باطنی سے آتا ہے جیسے اجہل واحمق اور بعض (صرفی) اور اس کا وزن کَانَ سے بھی جائز رکھتے جیسا کہ اصول میں ہے اور اس کو بنانے کا طریقہ رباعی سے اور ثلاثی مزید سے اور ظاہری لون وعیب سے اس طرح ہے کہ پہلے اسم تفضیل ثلاثی مجرد بنالیں گے جس میں قوت شدت یا زیادتی کے معنی ہوں اس کے ان کو اس کی تمیز بنا دیں گے اور کہیں گے زید بڑھا ہوا ہے اس کے مقابلے میں استخراجاً، بیاضاً وعمیاً اور اس کی جمع افعل وفعلی اور افاعل جمع افعل جیسے افضل کی جمع افاضل جو جمع تکسیر ہے لیکن (جہاں تک) جمع صحیح کا تعلق ہے وہ افعلون ہے جیسے افضلون اور فُعَلٌ فا کے پیش اور عین کے زبر کے ساتھ جیسے فُعَلٌ فعلی کی جمع ہے جیسے فضل ورحمۃ کی فضلی اور یہ جمع تکسیر ہے لیکن (جہاں تک) صحیح جمع کا تعلق ہے فعلیات ہے جیسے فضلیات میں کہتا ہوں اس جگہ اسم تفضیل کی جمع لانا اور اسم آلہ وظرف کا اور اسم فاعل ومفعول کے تثنیہ کا ذکر کرنا باعث طوالت ہے اس لئے تثنیہ وجمع کی بحث میں اس کا ذکر آئے گا۔" (دکاز الاصول ص ۳۲ و ۳۳)

۲۔ نور لاریب فی ترجمۃ فتوح الغیب:۔ "فتوح الغیب" سلسلہ عالیہ قادریہ کے سرخیل وامام الطریقہ حضرت خواجہ ابو محمد عبد القادر جیلانیؒ معروف بہ بڑے پیر صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو عربی زبان میں ان کے صاحبزادے شیخ شرف الدین ابو محمد عیسیٰ نے مرتب کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہر زمانے میں اہمیت کا حامل رہا ہے لیکن تصوف کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ حرزِ جان کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہٗ کے پاس چونکہ طالبانِ حق کی ایک اچھی خاصی تعداد اخذ فیض کے لیے حاضر ہوتی تھی اور وہ دیگر کتب تصوف کے ساتھ ساتھ "فتوح الغیب" کے مطالعہ کا حکم فرماتے تھے چونکہ مریدین کی کثیر تعداد عربی زبان سے ناواقف اور مطول شروح کے مطالعہ سے قاصر تھی اس لئے شاہ حمایت علی قلندرؒ نے بموجب ارشاد والد محترم مریدین کے استفادہ کے لئے اس کا لفظی ترجمہ کیا۔ جس کی صراحت انھوں نے خود بھی تحریر فرمائی ہے (ملاحظہ ہو نور لاریب ترجمہ فتوح الغیب (ص۱۱۱)

کتاب کا سرورق اس طرح ہے:

اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ

الحمد للہ کہ دریں ایوان فرخی اقتران کتاب مستطاب کامل النصاب مبرا از نقص وعیب المسمّٰی بہ

نور لاریب فی ترجمۃ فتوح الغیب

بفرمایش لائق مدح وستایش مقبول رب احد جناب منشی امیر احمد سلمہ اللہ الصمد رئیس کاکوری

در آسی پریس واقع لکھنؤ طبع شد ۱۳۲۳ھ

۱۱۲ صفحات کی ۲۱ سطری کتاب متوسط تقطیع پر ۸۰ مقالات پر مشتمل ہے۔ نمونہ کے طور پر "فتوح الغیب" میں مرقوم مقالہ اول (عربی) کا فارسی ترجمہ پیش ہے۔

مقالہ اول

(فرمود رضی اللہ عنہ وارضاہ) فرد است مر ہر مومن را از سہ[۳] چیز در تمام احوال او یکے امر حق تعالیٰ کہ بجائی آرد دوم نہی کہ بہ پرہیز داز آں سوم قضا و قدر کہ راضی باشد بداں پس کہ حال مومن آں کہ خالی نباشد در ہمہ احوال ازیں ہر سہ پس می باید کہ لازم گرداند قصد کردن ایں سہ دل خود را و حکایت کند بہ ایں ہا نفس را و کار کند و بگیرد جوارح را بہ ایں ہا در ہمہ احوال خود۔[۱]

۳۔ ملہم الصواب فی اتخاذ طریقہ اولی الالباب

فن تصوف میں فارسی زبان میں ۱۹ سطری ۳۲۸ صفحات پر مشتمل متوسط تقطیع کی اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء اور پیش نظر مخطوطہ کا سنہ کتابت ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء ہے۔

اس کتاب میں سلسلہ ثمانیہ یعنی قلندریہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، کبرویہ، فردوسیہ، مداریہ، طیفوریہ اور نقش بندیہ کا سلوک جو شاہ محمد کاظم قلندرؒ نے ان کو تعلیم فرمایا تھا بالتفصیل تحریر کیا ہے، نیز اس کے ساتھ ساتھ بہت سے فوائد متعلق بہ سلوک تحریر فرمائے ہیں۔ اس فن میں یہ بہت عمدہ اور جامع کتاب ہے۔ صاحب اذکار الابرار اس کی تعریف میں یوں منتظر ہیں:

"حق یہ ہے کہ اس کتاب کو لکھ کر آپ نے بہت بڑا احسان خاندان کاظمیہ پر عموماً اور دیگر سلاسل قادریہ، چشتیہ وغیرہ پر خصوصاً کیا ہے"۔[۲]

ابتدائی سطور میں حمد و صلوٰۃ کے بعد وجہ تالیف بیان کی گئی ہے۔

کتاب ایک مقدمہ اور دس مقصد و خاتمہ پر مشتمل ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

مقدمہ:۔ وجود علم لابدی بر سالک۔

۱؎ نور لاریب ص ۳۰-۲۰ ۲؎ اذکار الابرار ص ۳۶۴۔

مقصد اول[۱]:۔ در بیان عقائد اہل سنت۔

مقصد دوم[۲]:۔ در بیان طریقت کہ عبارت از تہذیب الاخلاق است بطور "منہاج العابدین" کہ از مصنفات امام غزالی است و دراں چند باب است "عقبہ توبہ[۱]" "عقبہ موانع[۲]" "عقبہ عوارض[۳]" "عقبہ بواعث[۴]" "عقبہ قوادح[۵]" و "عقبہ حمد و شکر[۶]"۔

مقصد سوم[۳]:۔ در بیان طریق معمور داشتن اوقات شب و روزی بہ اوراد و اذکار

مقصد چہارم[۴]:۔ در آداب معیشت بطور سنت و در آں چند باب است۔ اس میں علی الترتیب آداب نکاح اور اس کے متعلقات، کھانے پینے کے آداب، لباس کے آداب، گھر بنانے، داخل ہونے، نکلنے کے اور دیگر آداب، بال کٹوانے کے، مجلس کے، کلام کرنے کے، سفر کرنے کے، دوستوں نیز بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے آداب بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں۔

مقصد پنجم[۵]:۔ "در بیان بیعت" یہ ایک مقدمہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے، مقدمہ "در بیان ثبوت بیعت از جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے ہے اس کے بعد بیعت کے سنت یا واجب ہونے پر بحث ہے بعدہٗ کلمہ مشروعیہ شرائط شیخ، شرائط مرید، وفا و نکث، بیعت اختلاف و جواز تکرار بیعت اور وقت بیعت کے الفاظ ماثورہ نیز اجازت و خرقہ اور اس کے متعلقات کا بیان ہے۔

مقصد ششم[۶]:۔ "در بیان طریق سلاسل ثمانیہ" یہ ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ خانوادہ اور اس کی کثرت کے بیان میں ہے۔ پہلے باب میں طریقہ قلندریہ کے اذکار، طریقہ قلندریہ کے مراقبات اور طریقہ رابطہ شیخ کو تین[۳] فصلوں میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب باقی سلاسل کے سلوک کا بیان ہے جو بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔

مقصد ہفتم[۷]:۔ "در بیان موانع و عوارض سلوک کہ در اثنائے سلوک در پیش

آینہ" کے عنوان سے ہے جس میں اثنائے سلوک پیش آنے والے عوارض و موانع کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

مقصد ہشتم :۔ "در بیان طریق جذب و سلوک و نسبت ہائے سبعہ اولیاء اللہ کہ نسبت سکینہ و اویسیہ و یادداشت و عشق و وجد و توحید است" کے عنوان سے ہے۔

مقصد نہم :۔ "در بیان واقعات و تجلیات و انواع و کشف" کے عنوان سے ہے اور چار فصلوں پر منقسم ہے جس میں علی الترتیب واقعات و انوار تجلی اور انواع کشف کا بیان نہایت جامع و مانع الفاظ میں کیا گیا ہے۔

مقصد دہم :۔ "در بیان قبض و بسط کہ سالکان را در پیش آمد" اس میں راہ سلوک میں سالک کو پیش آنے والے قبض و بسط کو بیان کیا ہے۔

خاتمہ :۔ "در بعض وصایا کہ مرطالب حق را نفع باشد" کے عنوان سے ہے اور یہ بھی بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ آخر میں یہ عبارت درج ہے:

(تمام شد کتاب مولفہ مولوی حمایت علی مرحوم تاریخ بست و ہشتم رمضان ۱۲۳۶ھ)

۴۔ معدن علوی

تعویذ و نقش پر مشتمل فارسی زبان میں ۱۳ سطری ۲۶۶ صفحات پر مشتمل متوسط تقطیع پر ۱۲۰۶ھ کی مولفہ قلمی کتاب شاہ حمایت علی قلندر کی تصنیفات میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب دو معدنوں پر منقسم تھی۔ (۱) "معدن علوی" (۲) "معدن سفلی" بد قسمتی سے حصہ دوم یعنی "معدن سفلی" کا تمن امتداد زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگیا۔ راقم کے پیش نظر "معدن علوی" کا نسخہ جو ستر فصلوں پر منقسم ہے اور اس میں نقوش و تعویذات کے علاوہ مختلف اوراد و اعمال کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا۔ لکھتے ہیں:

"ایں رسالہ ایست کثیر الفوائد در بیان خواص حروف و اسماء و آیات و سور قرآنی ماخوذ از کتاب معتبر ایں فن در سن دوازدہ صد و شش ہجری ۱۲۰۶ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) نبوی جمع کردہ شد بمشقت بسیار امید که دائم ہر کسے کہ ازیں مستفید شد بدعائے خیر مرا یاد دارد عمل ہائے مجربات و ردم قوم خواہد شد۔" (معدن علوی قلمی)

تعزیتی خطوط

(۱)

علی گڑھ۔

۲۶ر جنوری ۲۰۰۰ء

محب محترم ! سلام مسنون

حضرت مولانا کی وفات عالمی سانحہ تو ہے ہی، ہندوستانی مسلمانوں کا بڑا سہارا جاتا رہا۔ ایسی صورت میں آپ جیسے حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

نیاز مند: نذیر احمد

(۲)

دودھ پور۔ علی گڑھ

۲۰ر ار ۲۰۰۰ء

محترمی جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ! السلام علیکم

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات کی خبر سے بہت رنج ہوا، ہندوستان ہی نہیں یہ عالم اسلام کا بڑا سانحہ ہے اور علمی دنیا کا نقصان عظیم۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ میں نے تعزیت کا خط مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب کو لکھ دیا تھا۔ اللہ انہیں اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یہاں شعبۂ عربی و شعبۂ اسلامیات کا تعزیتی جلسہ ہوا تھا۔ شعبۂ عربی فروری کے وسط یا اواخر تک حضرت مولانا پر ایک سیمنار منعقد کر رہا ہے۔ وائس چانسلر صاحب تاریخ کی

منظوری دے دیں تو آپ کو اطلاع بھیجی جائے گی۔ ایک مقالہ اس جلسے کے لئے تیار رکھئے۔

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

خیر طلب : مختار الدین احمد

(۳)

حبیب منزل علی گڑھ

۳؍ جنوری ۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

۱۹۹۹ء میں مسلمانانِ ہند کی اپنے وقت کی دو ممتاز ترین شخصیتوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے عمل کے میدان میں کتنے چراغ روشن کئے یا ان کی مدھم ہوتی ہوئی روشنی کو فروزاں کیا۔ طب یونانی، علوم اسلامی، تاریخ، سائنس و ٹکنالوجی، اسکول کی معیاری تعلیم، مسلمان نوجوانوں کی اعلیٰ مقابلجاتی امتحانات کے لئے تربیت ان کی نگاہ فیض رساں نے ان سب امور کا جائزہ لیا اور ان کے لئے مثالی عملی اقدامات کئے۔ ہمدرد دواؤں کی ایک معمولی دکان تھی ان کی بلند نظری اور جہدِ عمل سے آج یہ نام علم و صحت کی دنیا میں ایک روشن مینارہ ہے۔ ہمدرد دواخانے کے علاوہ ہمدرد یونیورسٹی اپنے مختلف شعبوں کے ساتھ شخص واحد کی دوربینی اور سعی پیہم کی گواہی دے رہی ہے۔ حکیم صاحب کا انکسار، شرافت، وضع داری، سادگی پسندی اور حسنِ اخلاق اس پر مستزاد تھا۔ وہ عہدوں اور اعزازات سے کہیں زیادہ بڑے تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی عالم دین تھے، شریعت اور طریقت کے جامع تھے، عربی اور اردو کے نامور مصنف تھے۔ اگر ایک طرف ماذا خسر العالم با نحطاط المسلمین ان کے جذبۂ دینی حمیت اسلامی، ملت کی دردمندی اور حسنِ انشا کا شاہکار ہے تو دوسری طرف تاریخ دعوت و عزیمت مردہ دلوں میں روح تازہ پھونکنے اور اپنے عظیم المرتبت جہاد پیشہ بزرگوں کی رفعت و بلندی کا نقش دلوں میں اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ان کی جوان العمری کی تصنیفات

ہیں۔ حضرت مولانا کے دل میں انسانیت کا جو درد تھا، وطن کی جو محبت تھی ملت کے مسائل کا نہ صرف عرفان تھا بلکہ ضعیف العمری کے باوجود ان کے لئے جس طرح وہ سرگرداں اور عملی اقدام پر آمادہ رہتے تھے اس وصف میں ان کا کوئی دوسرا شریک و سہیم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مقبولیت عطا فرمائی تھی وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو کتنے ادارے بظاہر بے روح اور بے رونق ہو گئے ہیں۔ ندوۃ العلماء کو انہوں نے اپنے دورِ نظامت میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا اور اس کی علمی، ادبی، دینی اور روحانی روایات کو کیسا استحکام بخشا تھا۔ دارالمصنفین کے وہ سرپرست اور اس کی مجلسِ عاملہ کے صدر تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل اور رابطہ عالم اسلامی کی روح رواں وہی تھے اور ان کی کمی ان اداروں کے کارکن مدت العمر محسوس کرتے رہیں گے۔

ہماری سیاسی بساط مدت سے الٹ چکی تھی۔ اس ملک کی ملت اسلامیہ میں اس کے آخری مردِ مجاہد مولانا محمد حفظ الرحمنؒ تھے۔ ان کی وفات کے بعد سے ہماری عوامی زندگی کا یہ گوشہ بالکل خالی ہو گیا تھا ایوانِ حکومت میں اس سے بھی پہلے سے سناٹا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور جناب رفیع احمد قدوائیؒ مرحوم کے بعد وہاں کوئی ایسا شخص نہیں رہا تھا جس کا وزن اور جس کی دھمک دوسرے ارکینِ حکومت محسوس کرتے۔ البتہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم جب تک تھے، حکومت سے ایک دوسری طرح کا واسطہ رکھنے کے باوجود مسلمانوں اور ان کے اداروں کے لئے بڑی ڈھارس کا ذریعہ تھا۔ پھر کسی عہدے پر کوئی متمکن رہا ہو، اس کی حیثیت ہمیشہ محض خانہ پُری کی رہی اور اب تو خانہ پُری کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی جا رہی ہے۔

اب سیاست و حکومت سے باہر کی دو اہم ترین شخصیتیں بھی ہم سے جدا ہو گئی ہیں۔ بالخصوص بیسویں صدی کے آخری دن مولانا علی میاں صاحبؒ کی وفات صرف مسلمانانِ ہند کا نہیں، عالمِ اسلام کا بھی بہت بڑا نقصان ہے۔ انہیں قومی اور عالمی پیمانوں پر کتنے اعزازات و انعامات کی پیش کش کی گئی،

چند قبول فرمائے اور باقی کو نظر انداز فرما دیا۔ میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا اعزاز خانہ کعبہ کی کلید برداری تھا جو ان کے عنداللہ مقبول ہونے کی بھی علامت تھی اور پھر رمضان المبارک کے جمعہ کو وفات پانا تو اس مقبولیت اور مغفوریت کا واضح اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ تعزیت کون کس سے کرے، ہم سب ہی اس کے مستحق ہیں۔

نیاز مند: ریاض الرحمن شروانی

(۴)

حبیب منزل، علی گڑھ

۲۰/۱/۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی! وعلیکم السلام

۱۳/جنوری کا نوازش نامہ پیش نظر ہے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ آپ لوگوں نے بڑی ہمت کی کہ ایسے سخت موسم میں، رمضان المبارک کے مہینے میں، ناوقت تکیہ ضلع رائے بریلی کا سفر نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے کیا۔ بے شک حادثے کی شدت اور آپ کا حضرت مولانا سے تعلق خاطر اس کا متقاضی تھا۔ اگرچہ نماز جنازہ میں شرکت نہیں ہوسکی لیکن حسن نیت کا ثواب ضرور حاصل ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی وفات پر مولانا محمد حفظ الرحمنؒ نے فرمایا تھا کہ جہاں تک اس ملک میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا تعلق ہے یہ آخری حادثہ ہونا تھا جو ہوگیا، اب کوئی حادثہ واقع ہونے کے لئے نہیں رہ گیا ہے۔ جب خود مولانا حفظ الرحمن کی وفات ہوئی تو دل نے محسوس کیا کہ ان کا یہ قول اب زیادہ صادق آتا ہے اور اب جب کہ مولانا علی میاں صاحب ہم میں نہیں رہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس قول کی صداقت کا صحیح وقت یہ ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قدرت اپنی فیض رسانیوں سے مختلف میدانوں میں مختلف میدان کار مہیا فرماتی

رہتی ہے لیکن یہ بھی اسی درجے میں درست ہے کہ جو میدان مولانا آزاد نے خالی کیا تھا وہ نہ آج تک پر ہوا ہے نہ مولانا حفظ الرحمن کا خالی کیا ہوا میدان اور نہ حکیم عبدالحمید صاحب یا مولانا علی میاں کے خالی کردہ میدان کے پر ہونے کی مدت دراز تک توقع ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللّٰھم اغفر لھم وارحمھم رحمۃ واسعۃ کاملۃ۔

نیاز مند: ریاض الرحمن شروانی

(۵)

۶/جنوری ۲۰۰۰ء

کرلا۔ بمبئی

برادر عزیز حفظہ اللہ تعالیٰ! سلام مسنون

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر ہوں گے۔ مولانا علی میاں کے سانحہ ارتحال سے دلی صدمہ ہوا۔ قوم و ملت اور عالم اسلام کے لئے یہ جاں کاہ حادثہ ہے۔ خداوند کریم انہیں اپنی خوشنودی کی جنت نصیب فرمائے۔ (آمین) آپ کی صحت و عافیت کا طالب: حکیم محمد مختار

(۶)

امام باڑہ جناب غفران مآب، لکھنؤ ۳

۲/۱/۲۰۰۰ء

محب معظم! سلام علیکم

میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کے فقدان پر آپ کے ذریعہ دارالمصنفین کے ادارے کو دردمندانہ تعزیت پیش کرتا ہوں اور استدعائے صبر جمیل کرتا ہوں۔ صرف ندوہ اور شبلی منزل پر ہی نہیں پورے عالم اسلام پر یہ سانحہ گراں ہے۔ مشیت مطلقہ اس کی شکیبائی آسان کرے۔ آمین!

بندۂ اخلاص: سید محمد نقوی

(۷)

شریعت کورٹ۔ ابوظبی

۱۰ جنوری ۲۰۰۰ء

مکرمی جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی ! سلام و برکات

امید ہے کہ آپ ہر طرح بخیر ہوں گے۔ حضرت مولانا علی میاں کے افسوس ناک سانحہ ارتحال کی خبر مجھے بروقت مل گئی تھی۔ اس عظیم حادثہ پر ابھی تک دل کو قرار نصیب نہیں ہوسکا ہے۔ دارالمصنفین کو مرحوم کی طویل سرپرستی حاصل رہی ہے اس لئے یہ حادثہ آپ اور ہم سب کے لئے ناقابلِ تلافی ہے اور ہم سب ہی ایک دوسرے کی تعزیت کے مستحق ہیں۔ گزشتہ سال اگست میں خادم کو حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ حسبِ معمول شفقت و محبت سے نوازا تھا۔ آہ کسے معلوم تھا کہ مرحوم کی یہ آخری دید و شنید ہے۔ اس آخری ملاقات کے وقت مرحوم نے آپ کی خیریت اور دارالمصنفین کا حال بھی دریافت فرمایا تھا۔ ندوہ اور دارالمصنفین دونوں کے لئے اس وقت ایک سخت آزمائش کی گھڑی ہے۔ اللہ جل شانہٗ اپنے فضلِ خاص سے آپ کو اور استاذی مولانا محمد رابع صاحب کو ہمت و حوصلہ اور طاقت عطا فرمائے۔

والسلام

خادم : محمد نعیم صدیقی

(۸)

خالص پور۔ اعظم گڈھ

۳ جنوری ۲۰۰۰ء

محترم و مکرم۔ سلام علیکم !

ہندوستان ٹائمز (یکم جنوری) کے صفحۂ اول پر یہ روح فرسا خبر پڑھی کہ مولانا علی میاں

اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اب تو چاروں طرف اندھیروں کا احساس ہی بڑھتا جارہا ہے۔ دراصل مولانا مرحوم امتِ مسلمہ کی نبض بھی تھے اور نباض بھی۔ قلب بھی تھے اور دماغ بھی۔ ہمہ تن وقف فی الدین تھے، عملی اعتبار سے بھی۔ اللہ جل شانہٗ مولانا مرحوم کے درجات بلند تر کرتا جائے اور امت کو نعم البدل عطا فرمائے۔

معروف مورخ ٹامسن بائنی نے متعدد جلدوں پر محیط شاہ کار تصنیف "مطالعۂ تاریخ" کا اختتام قرآنِ کریم کی ایک آیت پر کیا ہے۔ اس تعزیت نامہ کا خاتمہ میں بھی اسی آیتِ کریمہ پر کرتا ہوں : اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعاً۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

خاکسار : ابرار اعظمی

(۹)

وزارت سوشل ویلفیر، لیبر۔ ایمپلائمنٹ، حج و اوقاف

سری نگر کشمیر

محترمی و مکرمی ! السلام علیکم

برِصغیر کے نہایت ہی معروف و مقبول اور صفِ اول کے مایۂ ناز عالم جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی اس جہانِ فانی سے رخصت کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ دعا ہے کہ فردوسِ بریں ان کا مسکن ہو۔ جس شخص کے تبحرِ علمی اور دینی کارناموں کی گونج دیارِ مصطفےٰ تک سنائی دے رہی ہو میری کیا بساط کہ میں اس پر بطورِ اظہارِ عقیدت کچھ لکھ سکوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس عظیم مصنف اور قلم و قرطاس کے ذریعہ نصف صدی تک قوم و ملت کے اس خدمت گزار کے بے شمار سوگواروں میں میرا بھی نام آجائے۔ "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ؛ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

والسلام : بشیر احمد

وزیرِ حکومتِ کشمیر

مطبوعات جدیدہ

غالب پر چند تحقیقی مطالعے از جناب پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۔

غالبیات سے متعلق فاضل مصنف کے سات مضامین کا یہ مجموعہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ گو غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کثرت سے تحریریں موجود ہیں لیکن غالب کے خطوط اور کلام میں ادب، زبان اور تاریخ وغیرہ کے تعلق سے ایسے مسائل موجود ہیں جو نہایت سنجیدہ اور عمیق مطالعے کے متقاضی ہیں اور اسلام و ایران کی تاریخ سے بخوبی واقفیت کے بغیر ان کے افہام و تفہیم کی راہ آسان نہیں! اسی احساس کے پیش نظر ان مضامین میں بعض اشعار کی تلمیحات اور دستنبو و ساتیر کے متعلق غالب کے بعض تسامحات پر اظہار خیال کرتے ہوئے دساتیری عناصر کے سلسلے میں بالکل درست کہا گیا ہے کہ غالب کے کلام کے عمیق مطالعے کے باوجود دساتیری عناصر کی تلاش قرار واقعی نہیں ہوئی، چند اور مضامین میں غالب کے خطوط میں چند لغوی اشاروں سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں لفظ خسرا اور ضیمران کی بحث بڑی دلچسپ اور بلند پایہ مطالعہ و تحقیق کی حامل ہے، سلاجقہ اور مرزا غالب کے جد اعلیٰ کے باب میں بعض اہم تاریخی حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ بے شبہ اس مجموعے سے غالب فہمی کے باب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام مرتب جناب پروفیسر مختار الدین احمد، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۴،

قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

کتب خانہ خدا بخش کی مطبوعات کے سلسلے میں خطوط مشاہیر کی اشاعت بھی شامل ہے، اس کے لیے بجا طور پر سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا انتخاب کیا گیا ہے، بہار کے گورنر اور جمہوریہ ہند کے صدر کی حیثیت کے علاوہ خدا بخش لائبریری سے ان کا خاص ربط و تعلق اور اعتنا و محبت، محتاج بیان نہیں، ان کے خطوط کی دو جلدیں ادارے نے پہلے بھی شایع کی ہیں، اب اس تیسری جلد میں ڈاکٹر صاحب کے نامور معاصر مولانا دریابادی کے نام قریباً ساٹھ خطوط یکجا کیے گئے ہیں، مکتوب نگار و مکتوب الیہ دونوں کی ممتاز و جلیل القدر شخصیتوں کا عکس ان خطوط میں بڑا دلکش و دلآویز نظر آتا ہے، مولانا دریابادی کی صدق گوئی اور جذبہ احتساب اور ڈاکٹر صاحب کی شرافت و انکسار کے عناصر خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا بھی کہ "میں نے کبھی کوئی خط ایسا نہیں لکھا جو اشاعت کے قابل ہو"، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خوبصورت نثر میں یہ خطوط بڑے موثر، مفید اور دونوں نامور معاصرین کے مطالعہ میں خاص طور پر معاون ہیں، بہار کی گورنری سے سرفراز ہونے پر ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ "دعا کیجیے کہ راج بھون میں فقیر و درویش کی طرح دن کاٹ دوں، غفلت مسلط نہ ہو جائے، دیدہ بیداری اور خدا اندیشی نصیب ہو" یہ جملہ بھی ملاحظہ ہو کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دعا آپ نے تحریر فرمائی ہے اسے ان شاء اللہ ہر نماز کے بعد پڑھتا رہوں گا، کیسی جامع اور کیسی موثر دعا ہے، اس سے بہتر تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے"، ایک خط میں دارالمصنفین کے متعلق جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے "دارالمصنفین کی مجلس انتظامی میں شرکت میرے لیے تو باعث عزت افزائی ہے، منظور کیسے نہ کروں گا، لیکن آپ نے مجھے اس کے قابل کیوں سمجھا، محبت کی عیب پوشی کا کرشمہ ہوگا"۔ اس کے علاوہ جامعہ، مولانا محمد علی، اردو، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے تعلق سے بھی بعض اہم معلومات ہیں، خطوط پر حواشی کے علاوہ فاضل مرتب کے

قلم سے ایک جامع تعارفی تحریر بھی ہے، مولانا دریابادی کے متعلق ان کے برادرزادہ جناب عبدالعلیم قدوائی کا مضمون بھی شامل کتاب ہے، تصویروں اور خطوط کے عکس کے علاوہ اشاریہ سے بھی کتاب مزین ہے اور ادارہ خدابخش کی اعلیٰ روایات کے عین مطابق ہے۔

امتِ مسلمہ رہبر اور مثالی امت از جناب مولانا سید محمد رابع ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۵، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ باکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔ یوپی۔

مسلمانوں کے عروج و زوال اور اس کے وجوہ و اسباب کی تفصیل اس کتاب کا موضوع ہے جس کے تحت دیگر قوموں اور مذہبوں کے مقابلے میں امت مسلمہ کی معتدل حیثیت اور امتیازات و خصائص کا بڑی جامعیت اور غیر جذباتی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے، ایک باب میں مغربی فکر و ثقافت کا تجزیہ ہے اور آخر کے دو ابواب میں اسلامی معاشرہ کی موجودہ کمزوریوں اور اس کو درپیش خطروں کی وضاحت کے ساتھ اس کے علاج کی تدبیریں بھی بیان کی گئی ہیں، تاریخ و جغرافیہ کے وسیع مطالعہ اور اصل مرض کی صحیح تشخیص کے علاوہ دردمندی و جاں سوزی ان تحریروں میں نمایاں ہے، فاضل مصنف نے عربی زبان میں مختلف سیمناروں میں کتاب میں شامل چند مضامین پیش کئے تھے، ان کا ترجمہ سلیس ہے، البتہ اس قسم کے جملوں جیسے ہسپتالوں میں انشری فری تھی سے احتراز کیا جانا مناسب تھا۔ مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے ہے۔

اقبالیات آزاد از جناب ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۲۰۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

علامہ اقبال سے جناب جگن ناتھ آزاد کا رشتہ بہت گہرا ہے اور اب یہی تعلق جناب آزاد کی خاص شناخت بن گئی ہے، اس لذتِ آشنائی کو آزاد نے پوشیدہ بھی نہیں رکھا، ان کے لائق شاگرد اور اس کتاب کے مرتب کا جو خود بھی اقبال کے شیدائی ہیں اور اقبال پر سند تحقیق رکھتے ہیں خیال ہے کہ "اپنے معاصرین میں آزاد سے زیادہ اور کوئی اقبال سے متاثر نہیں" لائق شاگرد نے علامہ اقبال سے اپنے فاضل استاد کے تعلق کی داستان کو اس کتاب میں سلیقہ سے پیش کرکے حق شاگردی ادا کیا ہے، 'ماہ و سال کے آئینہ میں' عنوان سے انہوں نے آزاد کی زندگی کی توقیت، اقبالیات سے متعلق ان کی ہر تحریر کی مکمل فہرست، سری نگر میں اقبال نمائش اور انٹرویو وغیرہ یکجا کردیے ہیں اس کے علاوہ آزاد کی نثر و شاعری پر علامہ اقبال کے اثرات کے متعلق دو عمدہ مضامین بھی ہیں انٹرویو دو ہیں اور دونوں بہت دلچسپ ہیں جن سے خود جناب آزاد کی صداقت، سادگی اور شرافت نمایاں ہوتی ہے، ایک سوال کے جواب میں انہوں نے ادبی ذوق کی صحیح پرورش کے لئے کتاب و کائنات کے ساتھ بجائے کاکل کے کسی کامل کی صحبت کو ضروری قرار دے کر جوش ملیح آبادی سے اپنے فرق کا عمدہ اظہار کیا ہے، کتاب کا مبسوط مقدمہ جناب ایوب واقف کے قلم سے ہے۔

اذکارِ دکن از جناب پروفیسر شفقت رضوی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۶، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: بہادر یار جنگ اکادمی، بہادر آباد کراچی پاکستان۔

مرحوم حیدرآباد دکن اور سلطنت آصفیہ عثمانیہ کے ذکر میں عجب لطف ہے، علم پروری، قدرشناسی، سخاوت و فیاضی اور بے تعصبی و رواداری کی کیسی کیسی حکایتیں اور روایتیں اس کے دامن میں موجود ہیں، اسی سلسلہ میں یہ کتاب بھی ہے جس میں دارالترجمہ، مولانا حالی، فانی بدایونی، اور جوش ملیح آبادی کے حیدرآباد کے رشتوں سے متعلق دلچسپ معلومات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

خود نظام سابع کی شاعری پر مضمون بڑا دلکش ہے جوش والا مضمون خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے، اس کے علاوہ ترکی اور خلافت عثمانیہ کے بارے میں نظام حیدرآباد کے جذبۂ ہمدردی کا بیان بھی خوب ہے، فاضل مصنف نے مستند دستاویزات سے استفادہ کیا ہے، ان میں سے کچھ کی عکسی کاپیاں بھی دی گئی ہیں، اس سے پہلے ان کی ایک اور کتاب ' فیضان دکن ' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی، توقع ہے یہ کتاب بھی مقبول ہوگی، البتہ فہرست میں کلام الملوک ملوک الکلام کا سہو رہ گیا ہے۔

رئیس المعالجات ہومیوپیتھی از جناب ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۵۰۰، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی، تیمیہ لائبریری، مبارکپور، اعظم گڈھ، یوپی ۲۷۶۴۰۴۔

ایلوپیتھی کی گرم بازاری کے باوجود ہومیوپیتھی علاج کا اعتبار آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے، البتہ اس میں معالجوں کی صلاحیت و مہارت کا امتحان زیادہ سخت ہے، اس ضخیم کتاب کے مولف خود بھی اچھے معالج ہیں اور اس کتاب سے اس فن سے ان کی گہری واقفیت کے ساتھ سلیقہ تحریر کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے امراض کو حروف تہجی کے اعتبار سے تقسیم کر کے ہر مرض کی علامت، دوا اور اس کی طاقت کو اس خوبی سے مرتب کیا ہے جس سے باقاعدہ معالجوں کے علاوہ عام قاری بھی بآسانی استفادہ کر سکتا ہے، مولف کے خیال میں اردو میں اس موضوع پر کتابیں کم نہیں مگر کسی نہ کسی پہلو سے ان میں خامی کا احساس ہوتا ہے، یہی خیال اس کتاب کی تالیف کا محرک ہوا اور اس فن کے بعض نباضوں کی رائے ہے کہ مولف اپنے مقصد میں کامیاب ہیں، آخر میں ایک نقشہ تعلقات ادویہ کے نام سے ہے، دواؤں کے نام اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی ہیں جس سے کتاب اور بھی مفید و وقیع ہوگئی ہے۔ کمپیوٹر سے کتابت بھی قابل داد ہے کتاب کا نام بھی مصنف کے حسن ذوق کا آئینہ ہے۔ توقع ہے یہ کاوش قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی اور مقبول ہوگی۔

ع۔ ص۔